زیراہتمام: اُردو اکادمی جموں کشمیر سرینگر ۱۹۰۰۰۱

افسانوی مجموعہ

جناب محترم محمد مسعود صاحب کے لئے بطور ہدیہ پیش کر رہا ہوں

8/5/2015.

کلی کی بے کلی

شیخ بشیر احمد

نام کتاب : کلی کی بے کلی

مصنف : شیخ بشیر احمد

کمپوزنگ : فیروز احمد کمار، (تھری ڈی ڈیزائننگ 0194-2470016)

سرورق : معراج الدین

صفحات : 156

زمانہ : ۲۰۱۴ء-۲۰۱۵ء

زیرِ اہتمام : اردو اکادمی جموں کشمیر سرینگر

عام قیمت : ۹۴ روپے

رابطہ : 0194-2104598 , 09858989900

نوٹ:۔ ”یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ھے“۔

اس کتاب میں ظاہر کئے گئے کہانیوں کے کردار، واقعات اور مقامات فرضی ہیں۔ کسی بھی قسم کی مطابقت اتفاقیہ ہوگی۔

ملنے کا پتہ

۱۔ اردو اکادمی سرینگر

۲۔ شیخ بشیر احمد ٹینگہ پورہ نواب بازار سرینگر

۳۔ کتاب گھر سرینگر

فہرست

ایم رحمان، دہلی

شیخ بشیر احمد: ایک عہد ساز افسانہ نگار

زعفران اور میوہ جات کی خوشبوؤں سے معطر وادیٔ کشمیر عرصہ دراز سے بارود کی فضا میں سانس لے رہی ہے، یہاں بازار تو ہیں پر رونق بازار کا گماں نہیں ہوتا۔ ظلم وستم سے دور امن کی تلاش جاری ہے۔ انہی نامساعد حالات کے بے رحم دستے پر ادب کے شہرت یافتہ ممتاز ادیب، افسانہ نگار احساس کے سمندر میں دور تلک دکھائی دیتے ہیں، شیخ بشیر احمد (سرینگر) کا روشن اور ناموس نام ہے۔ موصوف اپنی تہذیب، اپنے تمدن، ماضی کی تلخیوں اور کھوئی ہوئی اقدار سے جذباتی رشتہ قائم رکھتے ہیں تو حالات حاضرہ اور کمھلائے ہوئے سماج کی بے روطفی اور کجروی سے کبیدہ خاطر ضرور ہیں مگر دل برداشتہ نہیں۔ مستقبل سے مایوس نہیں، آنے والے وقت کی آہٹ ان کے خوابوں کے افق کو منور کر رہی ہے۔ موصوف ایک باشعور، نکتہ شناس اور بے حد حساس فنکار ہیں۔ ان کے افسانے اپنے رویے سے آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے کا فن درشاتے ہیں، جو انہیں ممتاز کرتا ہے۔ کہانیوں میں دلخراش منظر نامے بھی موجود ہیں جس میں آج کا نام نہاد مہذب سماج اپنی برہنگی پر نقاب ڈالنے کی حکمت تو ضرور کرتا ہے مگر تمام تر نشانات کے ساتھ منعکس دکھائی دیتا ہے۔ دراصل درد و کرب سے یادوں کو جگنوؤں سے گوندھنے کا سلیقہ بھی خوب جانتے ہیں۔

میری پلکوں پہ اشکوں کا منظر رہا
رات بھر میرے گھر میں سمندر رہا

فکشن نگار شیخ بشیر احمد کے متعلق میں اپنی معلومات پر اعتبار کروں تو ان کا ادبی سفر 1969 میں ہوا جو ہنوز بحمد اللہ جاری ہے۔ کل کے حالات کی بے رخی نے بھی ان کا پیچھا کیا مگر جواں مرد ادیب نے اپنی زندگی کو بامعنی بنانے کیلئے ایک سوچا ہوا نشانہ بنایا تھا جس کی صداقت پر ان کا ذہن مطمئن ہے اور ان کا ضمیر سماجی اتھل پتھل اور بے راہ روی پر المناک مناظر سے مطمئن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے انسانیت کی تجربہ گاہ میں آکر اپنا مژدہ سناتے ہیں۔ آج بھی وہ یک سوئی کے ساتھ اپنے مقررہ نشانے پر عملی طور پر عمل کر رہے ہیں اور آتشی تحریر قاری کے دلوں میں گھر کر جاتی ہیں۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ موصوف جہاں عام و خواص آدمی کے افسانہ نگار ہیں وہیں ان کے یہاں مطالعے، مشاہدے کی کوکھ سے کہانیاں چھن چھن کر نکلتی ہیں اور پھر ان کی شخصیت اور فن دونوں کا سنگم ہوتا ہے تو ان کی ہمہ گیر شخصیت گڑھتی ہے۔

جب ہم افسانوی سفر پر غائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں تو پتا ملتا ہے کہ یہاں افسانے طویل اور مختصر دونوں ہیں۔ مگر یہ سبھی اپنی مقصدیت کی جانب سفر کرتے ہیں۔ یہ بڑا سچ ہے کہ شیخ صاحب اپنی فنی اور تکنیکی صلاحیت سے ایک طویل مدت سے افسانوی کائنات کو خونِ جگر سے سینچ رہے ہیں۔ ان کا یہ عمل ہمیں بھی محبوب ہے۔

زمانے کے بدلتے مزاج کے بھنور میں سماج کے سلگتے واقعات کو صفحۂ قرطاس پر اپنی نرم وتند گفتاری و سلیقگی کے ساتھ منظر عام پر لاتے ہیں اور اپنے فن کی چھینی سے ظلم کے خلاف جو بُت تراشتے ہیں ان کا رنگ وروپ وادیٔ کشمیر اور ملک کے اندر پھیلے ہوئے گمبھیر مسائل کے حل کیلئے سوالات کھڑے کرتے ہیں۔

عام طور پر اچھا ادب وہ سمجھا جاتا ہے جو اپنے دور کا عکاس ہو۔ جو یہاں اتم درجہ موجود ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ:

صبح کا دامن شفق کے نام کر جاتی ہے وہ
پھول کی پتی پہ جب ہوتی ہے شبنم بے پناہ

اور جب ہم حقیقت نگاری میں حقیقت پسندی کی بات کریں تو حقیقت کی نظر سے دیکھنے والوں کو ان کا لب ولہجہ ریشم کی مانند معلوم ہوتا ہے۔ زبان میں روانی اور برجستگی ہے۔

پہلا افسانوی مجموعہ ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' نے ملک گیر شہرت پائی۔ یہاں تو درد کے صحرا سے آواز آتی ہے جو افسانہ نگار کے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ جموں کشمیر اردو اکادمی، سرینگر نے اس مجموعہ کو شائع کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''رات کو بھوک سے ستائے بچوں کی شور وغل نے غزالہ کو ٹی وی (TV) آن کرنے پر مجبور کر دیا تاکہ ان کا دل بہل جائے، یہاں تک کہ نیند کا غلبہ ہونے پر آسانی کے ساتھ سو سکیں۔ اتفاق سے ٹی وی پر خبر نشر ہوئی، بچے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے اور پاپا کے نام کی رٹ لگانے لگے۔ مقامی چینل میں خبروں کے دوران پولیس کی ایک چھوتی سی ٹکڑی کے گھیراؤ میں شمس الدین کو دیکھایا جا رہا تھا، اسے بدنام دہشت گرد قرار دے کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی تھی۔ کندھے پر AK-47 لٹکائے سامنے فرش پر چاول بھرے تھیلہ میں دو بموں کی موجودگی کا بیان آرہا تھا۔''

درحقیقت فنکار نے اپنی دنیا خود تخلیق کی ہے۔ کسی بیساکھی کا سہارا نہیں لیا اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ ان کی کہانیوں میں مجھے تو پریم چند کی کہانی کا عکس نظر آتا ہے۔ سوچ میں یکسانیت کا بھی گمان ہوتا ہے جس میں کردار نگاری کا واضح شعور ملتا ہے۔ دراصل اردو کے مبلغ نے اپنے سوزِ دروں کی دھیمی دھیمی آنچ سے آس پاس کی سفاکی کو نم دیدگی بخشی ہے جہاں دور تلک افسانے کی عاجرائی کیفیت کا فنی اظہار ہے جو ابتدا سے آخر تک قاری کو اپنے طلسم میں باندھ رکھتا ہے۔ مجھے اخیر میں اعتراف کرنے دیجئے کہ شیخ بشیر احمد کی شخصیت اور فن پر اپنی پوری بات کو ادب کے قاری کے سامنے نہیں رکھ سکا اس کی وجہ یہ ہے یہ ہمہ گیر شخصیت کو ایک کوزہ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ ''کلی کی بے کلی'' کے بعد اب تو موصوف کے ''شیشے کی دیوار'' افسانوی مجموعہ کا انتظار ہے۔ .... ☆☆☆ ....

اجتناب

"بابو جی! ایشور کے نام پر کچھ دے دیں۔ وہ آپ کا بھلا کرے۔"

اچانک یہ سنتے ہی خورشید چونک کر اس کا منہ تکنے لگا۔ جانے کن خیالوں میں گم تھا۔ بگڑ کر اُس سے تُرش لہجہ میں بولا۔

"صبح صبح اپنی منحوس صورت دکھا کر میرا موڈ خراب کر دیا۔ جا کے کسی اور سے مانگ۔"

"ایک روپیہ کا سوال ہے، بابو جی!" ......متانت بھری آواز دوبارہ اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"کہا نا۔ اپنا راستہ لو، کیا بھیک مانگنے کے لئے یہی جگہ مل گئی تھی۔"

"کیا کروں، بابو جی! چند روز پہلے میری جھونپڑی جل گئی ہے اور کچھ بھی نہیں بچا۔ میں لُٹ گئی، برباد ہو گئی۔"

"تمہاری ان باتوں کا کیا بھروسہ۔"

"یہ دیکھئے نا، اس اخبار میں اس واردات کی خبر چھپ چکی ہے۔" بھکارن نے اپنی جھولی سے اخبار نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"رہنے دو۔ میں اسے دیکھ کر کیا کروں گا۔ ایک بار جو کہہ دیا نا، میرا دماغ اب خراب نہ کر۔ جا کے کسی مندر یا مسجد کے باہر بیٹھ کر بھیک مانگ لے۔"

اس کی پھٹکار سنتے ہی بھکارن اپنا سا منہ لے کر وہاں سے کھسک گئی اور پھر بغل والی دوسری میز کے قریب آ کر بوڑھے جوڑے، جو لسی پی رہے تھے، کے سامنے گڑگڑانے

لگی "بابو جی! ایشور کے نام پر کچھ دے دے......"

اُس کے جاتے ہی وہ تھوڑی دیر تک اسے غصّے بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر خود ہی اس کا پارہ اتر گیا۔ اُس نے سامنے پڑا اخبار اٹھالیا۔ اخبار کے پنے پر موٹی موٹی اور جلی سرخیوں پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ جب کوئی دل موہ لینے والی خبر نظر نہ آئی تو اس کی آنکھوں میں غصہ اُتر آیا۔

دیکھنے میں اتنی بُری بھی نہیں لگتی تھی موہنی جیسی صورت سے پتہ چلتا تھا کہ واقعی اس جیسی صورتوں والی کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ کھلے کھلے چہرے کے اُبھرے داہنے رخسار پر ایک چھوٹا سا تِل تھا، جیسے گل لالہ کا پھول دِکھتا ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ جب وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو دروازے پر دونوں کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ جانے کیوں خورشید کے دل میں اس کے لئے بے تحاشہ ہمدردی اور عقیدت جاگ اُٹھی۔ وہ اس زاویے سے نیچے جھک گئی تھی کہ سینے پر سے اس کا آنچل ڈھلک گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے ساکت و جامد ہوکر رہ گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جذبات پر اوس پڑگئی۔

اتوار کی چھٹی تھی۔ آج صبح جب خورشید یہ سوچ کر گھر سے نکلا تھا کہ سیر سپاٹے کے بعد لوٹتے وقت سبزی منڈی جاکر سبزیاں اور ترکاریاں خرید لائے گا تو ساتھ ہی کسی ریسٹورنٹ یا ڈھابے میں ہلکا پھلکا ناشتہ بھی کرلے گا۔ کہتے ہیں نا کہ ورزش کرنے کے بعد متوازن اور مقوی غذا کھانے سے صحت و تندرستی برقرار رہتی ہے لیکن سبزی منڈی میں سبزیوں کے بھاؤ نے اس کا بُرا حال کردیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ وقت سے پہلے ہی لوٹا اور ایک اوسط درجے کے ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا۔ یہاں ہر وقت سستے داموں پر چائے اور تنوری روٹیاں مل جایا کرتی تھیں۔ ادبی ذوق رکھنے والے کچھ لوگ بھی یہاں ہر روز مغرب کے بعد سے دیر رات گئے تک محفل جماتے تھے، جس میں شہر کے بہت سے ادیب اور شاعر شریک ہوتے تھے۔

وہ ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں آکر کرسی میں دھنس گیا۔ بار بار اخبار کے صفحات اُلٹتا پلٹتا رہا۔ اب تھک کر وہ ایک شدید قسم کی اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا، جیسے دور

کرنے کے لئے اس نے ویٹر سے چائے منگوائی جس نے منٹوں میں حکم کی تعمیل کی۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کی متحیر نظریں بار بار اس جانے پہچانے شاعر کی جانب اُٹھ رہی تھیں، جو ہال کے دوسرے گوشے میں الگ تھلگ بیٹھا پڑھنے میں اس قدر محو تھا کہ اس کے چہرے پر جیسے ایک رنگ آتا اور چلا جاتا جو اس کی اندرونی کیفیت کی داستان بیان کرر ہا تھا۔

جب خورشید سے رہا نہ گیا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر چپکے سے اس کی بغل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''دوست! آج آپ کچھ اُداس اُداس سے لگ رہے ہیں، بات کیا ہے؟''

''کیا بتائیں خورشید میاں!......'' اس کی آواز رندھی ہوئی جیسی لگ رہی تھی۔

''کچھ تو بتایئے نا۔ یہ چہرہ کیوں اُترا اُترا دکھائی دیتا ہے۔ آپ تو ایسے نہ تھے''۔

''کیا آپ نے آج کا اخبار نہیں پڑھا ہے۔ پڑھ کر دل برداشتہ ہو گیا۔

''پڑھا تو ضرور مگر کوئی پُر اسرار اور چونکا دینے والی خبر نظر نہ آئی۔ ذرا مجھے بھی وہ خبر سنائیں جس نے آپ کو پریشان اور افسردہ بنا دیا ہے''۔

''سوچتا ہوں، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہر طرف ہنگامے، قتل و غارت گری، حسد اور نفرت کی آگ دہک رہی ہے۔ یہ دیکھئے برما میں کیا ہو رہا ہے۔ چوراہوں پر ادھ جلی لاشیں، اعضاء کٹے ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں جسم چیرے ہوئے۔ ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ جان بچانے کی خاطر لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں بھاگ گئے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں سرحد عبور کر کے ہندوستان آرہے ہیں''۔

''مرزا صاحب! یہ سب کچھ برما میں ہی نہیں ہے۔ یہ کشت و خون فلسطین اور شام میں بھی ہو رہا ہے اور خود ہمارے ملک میں بھی۔ کیا مالیگاؤں بھول چکے ہیں اور کشمیر کو دیکھ کے تو روح کانپ اُٹھتی ہے''۔ خورشید کی آواز کسی گہرے کنوئیں میں سے آتی ہوئی سنائی دی۔ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ماحول پر ایک سکتے کا عالم طاری کر دیا۔

چند ساعتیں خاموش رہ کر مرزا علی نے اپنے دل پر سے بھاری سِل ہٹاتے ہوئے کہا:

''اب دیکھئے نا پچھلے کئی دنوں سے پورے اُتراکھنڈ میں جو کتنی تباہی مچ گئی، کتنے لوگ مر گئے، سیلاب کے ریلوں میں گاؤں کے گاؤں بہہ گئے، فصلیں تباہ و برباد ہوگئیں۔ مال مویشی تو ہزاروں کی تعداد میں ہلاک ہوگئے، لاکھوں اناج بھری بوریاں پانی میں بہہ گئیں۔ کسان تو بے موت مارے گئے، وہ تو دانے دانے کے محتاج بن گئے۔ کیا ہمارا فرض نہیں بنتا کہ ہم ان کی مدد کریں۔''

مدد! کیوں؟

''سرکار کس کام کی ہے، خود راحت اور آبادکاری کا کام انجام دے گی''۔

اچانک خورشید کی باتوں میں طنز کا رنگ چھا گیا۔ شاید اُسے چڑانے کی خاطر ایسا تیر مارا جو سیدھے اس کے نشانے پر جالگا۔ جسے مرزا علی برداشت نہ کر پایا۔ طیش میں آکر اس نے اُسے ایسا جواب دیا کہ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''شرافت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کیسے عجیب آدمی ہیں آپ...... منہ دیکھے کی سب کہتے ہیں خدا لگتی کوئی نہیں کہتا۔ خدا جانے آپ کو کیا ہو گیا کہ عجیب باتیں کرنے لگے ہو''۔

''بھئی مجھے اس جھنجھٹ میں نہ ڈالو۔ آؤ اپنی بات کر لیتے ہیں۔ میں راحت کاری کے لئے ایک دمڑی دینے والا نہیں۔ کل کا مشاعرہ کیسا رہا؟''

کیتلی میں گرم گرم چائے سے اُٹھتی بھینی بھینی خوشبو اور ایش ٹرے میں پڑے سگریٹ کے اَدھ جلے ٹکڑوں سے تمباکو کی بو کا اثر ایسا رہا کہ کچھ دیر تک دونوں نے اپنے اپنے نظریے سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی بڑی کوشش کی مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ بات جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں آکر ختم ہوگئی...... وہ سوچنے لگے کہیں وہ اصل موضوع سے کہیں ہٹ تو نہیں گئے۔ آج شام ہولی اور عید ملن پارٹی دینے کی تقریب پر اُردو کمیٹی نے ایک میٹنگ بلانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

پھر کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سامنے کی دیوار پر جو گھڑی ٹنگی تھی، ٹھیک سات بجے اس کا الارم بج اٹھا۔ دونوں اُٹھ کھڑے ہو کر اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

شام ہونے میں ابھی تھوڑا سا وقت تھا اور اُجالا ہلکی ہلکی تاریکی میں تحلیل ہو رہا تھا۔ خورشید ریسٹورنٹ میں اپنے من کا بوجھ ہلکا کر کے گھر لوٹ رہا تھا۔ چونکہ اس وقت سڑک پر ٹریفک کی ریل پیل معمول سے کم پڑتی دکھائی دیتی تھی۔ لہٰذا وہ مست ہاتھی کی طرح جھومتا اور لہراتا ہوا بڑھ رہا تھا۔

راستے میں اس نے ایک جگہ بھیڑ دیکھی۔ آگے بڑھا تو دیکھا ایک نوجوان چاروں شانے چت سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا سارا بدن خون سے لت پت ہے۔ شاید سر پر گہرا گھاؤ لگنے سے کافی خون بہہ نکلا تھا جو سڑک پر ایک پتلی لکیر کی مانند دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔

بڑا دردناک منظر تھا۔ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس سے یہ رقّت آمیز منظر دیکھا نہ گیا۔ یک لخت آنکھوں کے سامنے برما، فلسطین، شام اور کشمیر کے لوگوں کی تصویریں گھومنے لگیں اور ان کی آہ و فغاں کی صدائیں کانوں میں سنائی دینے لگیں۔

اس نے فوراً اپنا ارادہ ترک کیا جو آج صبح مرزا علی کے سامنے بیان کر چکا تھا۔ وہ سامنے اس ریلیف فنڈ کے آفس کی طرح بڑھا جو بلا ناغہ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ جہاں شد و مد سے اتراکھنڈ کے سیلاب زدگان کے لئے امدادی فنڈ اکٹھا کیا جا رہا تھا۔

ابھی وہ چند گز ہی آگے بڑھا کہ دور سے اُسے کچھ کچھ پہچانا سا چہرہ نظر آیا، وہ آنکھیں میچ کر دیکھنے لگا۔ ہاں! یہ وہی ہے، وہی بھکارن، جس نے صبح کے وقت اس کے اندر ایک تلاطم سا برپا کیا تھا۔ وہ بڑی سج دھج کر بیوٹی پالر کی سیڑھیاں سے اُتر کر اس کے بدن کو چھو کر گزر گئی اور ایک ادا کے ساتھ پاس کھڑے آٹو رکشا میں سوار ہو کر کسی تتلی کی طرح اس کے ہوش اُڑا کر چلی گئی!!

اس کی آنکھوں کی روشنی دُھندلانے لگی، جیسے اخبار میں چھپی جلے ہوئے گھر کی تصویر کے اندر سے راکھ اُڑ اُڑ کر اس کی آنکھوں میں دھنستی چلی گئی۔

............☆☆☆............

یہ کیسی خلش......؟

یونہی وہاں اُسکے بیٹھے رہنے میں کوئی راز پوشیدہ تھا۔۔؟

اور پھر برسوں پرانا چنار کا پیڑ بھی ایسے موڑ پر ایستادہ تھا کہ جہاں اسکی چھاؤں تلے گرمی کی تمازت اور جھم جھم برستی بارش کے دنوں میں اُسے بیٹھنے کی عادت سی ہو چکی تھی۔

وہ دن بھر آلتی پالتی مارے بیٹھی بیٹھی ہر سامنے سے گزرنے والوں کو بخوبی دیکھ سکتی تھی اور اِدھر سے گزرنے والے بھی اُسے ایک نظر دیکھ کر اپنی اپنی راہ لیا کرتے تھے۔ خدا کے کچھ بندے ایسے بھی تھے جو بن مانگے اسکی جھولی میں خدا کی رضا کیلئے کوئی نہ کوئی سکہ ڈال دیتے اور کچھ ایسے نامراد بھی تھے جو اسکی حالت زار پر ترس کھانے کے بہانے اپنی مراد کی بھر آوری کیلئے ایک دو روپیہ تھما کر دعا کی التجا کر کے نکل جاتے مگر کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی نظریں بچا کر چپ چاپ چلتے بنتے۔

نہ جانے وہ کس آب و گل سے بنی تھی کہ جبھی کسی اپ ٹو ڈیٹ نوجوان کو دیکھتی۔ زیرلب مسکرا کے رہ جاتی۔ لبوں سے بے تحاشہ ''کر بھلا ہو گا بھلا'' کا فقرہ کسی پھوار کی مانند پھوٹ پڑتا۔ مگر پھر اگلے ہی پل چہرے پر ایک اُداسی کی چادر سی پھیل جاتی۔ آنکھوں میں تجسس بھرا کوئی نامعلوم خوف متزلزل دکھائی دیتا جیسے کسی نے اُسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

جب سے میں اس بستی میں آیا تھا۔ اُسے اسی طرح دیکھ رہا تھا۔ جانے اسکی آنکھوں میں کونسا راز پوشیدہ تھا جو میری سمجھ سے باہر تھا۔

یہی کوئی چھ مہینے پہلے میرا یہاں اس علاقہ میں ٹرانسفر ہو چکا تھا۔ تب سے ڈیرے سے اسکول تک موڑ پر کھڑے اسی چنار درخت کے مختصر سے راستے سے آنا جانا پڑتا تھا۔ اسلئے کہ بستی کی بیرونی پختہ سڑک پر خوب آمد و رفت بنی رہتی تھی جو لمبے فاصلے اور بھیڑ بھاڑ کی

وجہ سے اسکول پہنچنے میں دیری کا سبب بنتی تھی اور پھر اس راستے سے میرے پاؤں اسقدر مانوس ہو چکے تھے کہ بے اختیار خود بخود اسی طرف بڑھتے چلے جاتے۔

جب پہلی بار میں اُس راستے سے گزرا تھا تو اس بھکارن کو اسی چنار درخت کے نیچے اونگھتا ہوا پایا تھا تب میں ایک منٹ کیلئے رکا تھا۔ جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اسکی طرف لاپروائی سے اُچھالا تھا اور بے باک ہو کر آگے بڑھ گیا تھا۔

اُس نے ڈھیر ساری دعائیں دیں تھیں جو مجھے اچھی لگیں اسکی دُعا میں اتنی تاثر تھی کہ سن کر اچانک میرے بڑھتے قدم چند ساعتوں کیلئے ساکت ہو گئے تھے۔ ایسا لگا تھا جیسے برسوں بعد شہد گھولتی آواز میری سماعت سے آٹکرائی ہو جس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اچانک پرانی بیتی یادوں نے تازہ ہو کر آنکھوں میں نمی پیدا کر دی تھی اور پھر میں انہیں بڑی مشکل سے پلکوں تلے چُھپاتے ہوئے آگے بڑھا تھا۔

مجھے وہ دن یاد آ گیا۔

جب میں اسکول کے بعد کالج جانے لگا تھا اور دروازہ پر کھڑی ہو کر اماں اب میرے نکلتے وقت ہمیشہ اسی طرح تب تک خوب ساری دعائیں دیتی رہتی جب تک کہ میں اسکی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا وہ ٹکٹکی باندھے دور تک مجھے دیکھتی رہتیں۔ اپنی محبتیں نچھاور کرتی رہتیں۔

خدا مغفرت کرے ان کی آواز میں کتنی لوچ اور مٹھاس تھی کہ بات کرتی۔ تو لگتا کہ جیسے کسی گرتے جھرنے کا ساز بج رہا ہو۔ لیکن اب اماں نہ رہی تھیں البتہ اُس بھکارن کی دعائیں دیتے رہنے کا انداز مسحور کن ضرور تھا۔ دن گذرتے گئے۔ وہ مجھے دور سے آتے دیکھتے ہی زیرلب مسکرایا کرتی۔ ڈھیر ساری دعائیں دے دے کر شاد کرتی رہتی۔ اب یہ اسکا روز کا معمول بن چکا تھا...... شاید اس نے میری صورت اپنے من مندر میں بسالی تھی۔

اسکی دعاؤں کے خیال سے اسکول روانہ ہونے سے پہلے میں اپنی جیب میں کچھ نہ کچھ ریز گاری ضرور رکھ دیتا اور کوئی ایسا دن نہ گزرا ہو گا جب میں نے اُسے کچھ نہ کچھ نہ دیا ہو۔ رفتہ رفتہ میرے اندر کوئی احساس جاگا۔ میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ جب جب بھی

اسکے پاس سے گزرا ہوں تب تب اسکی آنکھوں میں ایک مسلسل تلاش اور تجسس کروٹیں لیتی ہیں۔ جس نے شاید اسکی زندگی تلخ سے زہر آلود بنا دی ہے۔ گو یہ سوچنا میرے لیئے ایک غیر شعوری عمل تھا لیکن کسی غیر مرئی جذبہ کے تحت میں اسکی طرف کھینچتا ہی چلا گیا اور اسکے بیتے کل کے متعلق سوچنے لگا۔ رہ رہ کر اسکی خاموش سنجیدہ پرنم آنکھوں میں جھانکنے اور اس کے غم کی داستان سننے کا اشتیاق بڑھ گیا۔

وہ جتنی بے بس اُداس اور مغموم دکھائی دیتی تھی۔ اسکی کہانی اتنی ہی پُر اسرار محسوس ہوئی۔ وہ اگر چہ خوش طبیعت ہونے کے باوجود بے بسی کی مظہر تھی مگر پرانے پھٹے اور پیوند لگے کپڑوں میں خود کو صاف ستھری رکھنے کا خیال خوب کیا کرتی۔ چہرے پر جھریوں نے ابھی اپنا جال نہ بچھایا تھا۔ بدن پر برائے نام گوشت پوست ہڈیوں سے اس طرح چپکی ہوئی۔ گویا کوئی مریل سی بکری دھوپ سیکنے کیلیئے باہر چھوڑ دی گئی ہو۔ سوکھی اور لچکیلی مگر اُبھرے رخساروں کے خدوخال دیکھ کر ایسا لگتا کہ ہو نہ ہو کسی کھاتے پیتے گھرانے سے اسکا رشتہ ٹوٹ گیا ہو۔

بستی والوں کا کہنا تھا کہ وہ کسی شہر سے بھاگ کر یہاں آ گئی ہے اُسے کسی بیگر ہوم یا اولڈ ایج میں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہاں زمانے کی ستائی ایسی کئی بے آسرا مرد و زن کیلیئے رہائش وخورد ونوشت کا معقول اِنتظام اور بندوبست ہوتا ہے۔ جبکہ بقول عوام بازاروں میں پڑی نصیبوں کی ستائی عورتیں ہاتھ پھیلانے کے علاوہ دوسرے نامناسب طریقوں سے روزی روٹی کما کر سماج اور قوم کے لئے بدنامی کا باعث بھی بن جاتی ہیں اور شاید یہ بھکارن اسی طرح کی کوئی بدنام اور دھتکاری ہوئی عورت ہو........ لیکن میرا زاویہ نظر ان سب سے مختلف تھا میں اُسے کسی عزت دار گھرانے کی ایک فرد کی حیثیت سے محسوس کرتا تھا۔

نہ جانے اس پر کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا؟ جو وہ اسکے نیچے دب کر ٹوٹ چکی تھی۔ وہ کونسا ایسا غم کا پہاڑ تھا جس نے اُسے گھر سے کھدیڑ کر باہر سڑک پر بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے اس کے لئے پریشان نہیں ہونا چاہیئے مگر پھر انسان ہونے کے ناطے ضمیر کی ملامت پر سوچنا پڑا کہ میں اس کی جھیل جیسی آنکھوں کی گہرائیوں میں غوطہ بھی لگا تا رہا ہوں۔ پھر

جب ایک دن مجھے اُمید کی موہوم سی جھلک نظر آئی۔ میں نے بات آگے بڑھائی۔ اُس نے برا منانے کی بجائے ہنس کر ٹال دیا۔ اسی طرح مسلسل کئی دنوں تک اسکے نفی کرنے سے میرا شک یقین میں بدلا تو اصرار اور بھی بڑھتا چلا گیا۔

ایک دن میں اسکول سے وقت سے پہلے ڈیرے پر لوٹا۔ اسلئے کہ کئی دنوں سے اپنے گھر نہ جا سکا تھا۔ بیوی بچوں کی بھی خوب یاد ستا رہی تھی۔ اسلئے حسب معمول اسی مختصر سے رستے سے واپس لوٹا۔ جس کے موڑ پر چنار درخت کے نیچے بھکارن عورت بیٹھی رہتی تھی۔ اسکے قریب جا کر میں بیس روپے کا نوٹ تھماتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

''مائی! ایک دو دن بعد میرا یہاں سے تبادلہ ہونے والا ہے۔ فی الحال میں اپنے گھر جا رہا ہوں اس سے میری طرف بخشش کے طور پر رکھ لے۔''

یہ سنکر وہ چونکی نہ مایوس ہوئی اور نہ ہی خوش ہو کر کسی قسم کا ردعمل ظاہر کیا۔ بلکہ بالکل سپاٹ اور دھیمی آواز میں صرف اتنا بولی۔

''تو کیا تھوڑے دن اور نہیں ٹھہر سکتے؟''

''نہیں مائی، نوکری کا سوال ہے نا، ایک مدت سے اپنے گھر بھی نہ جا پایا ہوں''

''کیوں؟''

''ملازمت کی بیڑی جو پڑی ہے۔ ہاں تو مائی۔ مجھے تھوڑے دن اور ٹھہرنے کے لئے کیوں بولی ہو؟''

''وہ کیا ہے نا بیٹا کہ شاید مجھے بھی آج نہیں تو کل یہاں سے اپنا ڈیرہ بدلنا پڑے۔''

اس نے میرے معاملے کی نوعیت جانے بغیر ہی اپنا ارادہ ظاہر کر دیا کہ جسے سنکر مجھے قدرے حیرانی ہوئی اور میں ہونقوں کی طرح اسکا منہ تکتا رہ گیا۔ ایسے لوگوں کا کیا بھروسہ جو خانہ بدوشوں کی طرح اپنا ٹھکانہ بدلتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ دن بھر کی کمائی سے اسکی ضرورت پوری نہیں ہوتی ہو اور اب دوسری جگہ بھیک مانگنے کا ارادہ کر چکی ہے۔

مجھے اسکے اچانک جانے کا ارادہ جان کر نہ کچھ تاسف ہوا اور نہ ہی کوئی تعجب ہوا۔

نہ ہی اسکی بیتی زندگی کی کھلی کتاب کے گمشدہ اوراق ٹٹولنے کا اشتیاق رہا۔ مگر لفظ ''بیٹے'' نے پاتال کی گہرائی میں ضرور پہنچا دیا۔ جبکہ اس سے پہلے ''صاحب''۔ ''بابو جی'' کے شیرین الفاظ سننے کے میرے کان عادی ہو گئے تھے، میں نے اپنے دل کی کیفیت ظاہر نہ ہونے دی مگر پرشکوہ انداز میں اتنا کہا۔

''مائی۔ تم نے آج تک اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ مجھے اسکا دُکھ نہیں۔ لیکن آج ''بیٹے'' جیسے ''عزیز'' لفظ سے مخاطب ہوئی تو بڑا عجیب سا لگا۔ حقیقت پر پردہ کئے بجائے اپنی بیتی روداد سنا دیتی تو شاید میرا دل ہلکا محسوس کر لیتا۔ جیسے میری بات اسکی دکھتی رگ کو چھو گئی ہو۔ کچھ دیر تک سوچ کر وہ بولی ''وہ بھی بتاؤں گی بیٹا۔ پہلے کیا تم میرے سوال کا جواب دے پاؤ گے؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ پوچھو پوچھو''

''آپ کی نظر میں لفظ عزیز کو سمجھتی ہوں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں بشرطیکہ وہ صالح اور فرمان بردار ہو۔ اگر بیٹا لفظ عزیز ہے تو ماں کے لفظ کا درجہ کیا ہونا چاہیئے؟''

یہ سوال پوچھتے ہوئے اسکے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ عیاں ہو گئی۔ آنکھوں میں نہ سمجھ آنے والی چنگاری سلگی جسے دیکھ کر میں سہم سا گیا اور میرے منہ سے بے تحاشہ نکلا۔

''مائی! ماں کے قدموں تلے تو جنت ہوتی ہے''

میرا جواب سنکر نہ جانے وہ کس خیال میں ڈوب گئی۔ تھوڑی دیر دور خلاؤں کو تکتی رہی، شعوری اور غیر شعوری طور پر لب تھر تھرانے لگے۔ یوں لگا کہ خاموشی کی طنابیں ٹوٹنے والی ہیں۔ یکا یک اسکی بھیگی آنکھوں کے پیچھے سے جو درد انگیز داستان افشا ہوئی تو مجھے اسکی باتیں کچھ حیران کن و عجیب سی مگر تھوڑی سی دلچسپ بھی لگیں۔ وہ درد انگیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''بیٹا۔! میرا بھی ایک بھرا پُرا کنبہ تھا۔ پیسہ تھا۔ ایک چاہنے والا شوہر تھا۔ ایک بڑا خوبصورت مکان تھا۔ دو جوان بیٹے تھے۔ زندگی بڑے سکون سے کٹ رہی تھی اور کیا چاہیئے تھا۔ بڑے ذوق و شوق و لگن سے ہم نے دونوں بیٹوں کو پالا پوسا لکھایا پڑھایا اور جب بڑا بیٹا

بالغ ہو گیا تو اسکی شادی کر دی۔ بہو گھر آئی تو شروع میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔لیکن اچانک ایک طوفان آیا۔دھیرے دھیرے جانے کیا ہوا کہ اسکی تند مزاجی سے گھر کا ماحول بگڑنا شروع ہو گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے علیٰحدگی اختیار کر کے دوسری جگہ اپنی دُنیا بسالی۔ اس صدمے کی تاب نہ لا کر ان کا باپ چل بسا۔ چھوٹا بیٹا ہونے کے باوجود میں تنہا سی پڑ گئی۔لیکن رہی سہی اُمیدیں اسی سے باندھے رکھی اور جب اسکی شادی کر دی تو کچھ مدت بعد دوسری بہو نے بھی من مانیاں شروع کر دیں۔ میں نے سمجھایا تو الٹا مجھ پر برس پڑی۔

دھیرے دھیرے میرے بیٹے کو اپنے بس میں کر کے مجھے مکھن میں سے بال کی طرح باہر نکال پھینکا۔ میں بدنصیب دو دو بیٹوں کے ہونے کے باوجود دُوسروں کے گھروں میں یہ سوچ کر نوکرانیوں کی طرح جھوٹے برتن دھو کر گزارہ کرنے لگی کہ شاید کسی ایک بیٹے کا غیرت کے مارے دل پسیج جائے مگر ایسا نہ ہوا۔انہوں نے میری کوئی خبر نہ لی اور جب میں پوری طرح سے ٹوٹ گئی تو اُنہیں رسوا کرنے اور ان سے انتقام لینے کے لیئے میں نے یہ بھیک مانگنے کا ڈھونگ رچا لیا۔ ورنہ بیٹا! میں پیشے سے بھکارن ہرگز نہیں تھی اور اب یہاں سے جانے کا ارادہ اس لیئے کیا ہے کہ ان میں سے کسی کی نگاہ آج تک مجھ پر نہ پڑا ہے۔ اسلیئے اب ایسی جگہ جا بیٹھوں گی جہاں انہیں دھتکارنے والے بہت ملیں"۔

یک لخت اپنی داستان غم سناتے ہوئے اسکی آواز رندھ ہو گئی اور ایک طویل سی خاموشی چھا گئی۔ میں نے ثانیہ دو ثانیہ اسکے چہرے پر کریدتی ہوئی سوالیہ نگاہ ڈالی اس کی ڈبڈباتی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ اسکے رخسار پر ڈھلک آیا تھا۔ایسا لگا کہ اب اسکے پاس کہنے کے لیئے کچھ باقی نہ رہا تھا۔بس بیٹھی ٹکٹکی لگائے ایک ٹک مجھے دیکھے چلی جا رہی تھی۔

چند لمحات میں یوں ہی ساکت و جامد سر جھکائے کھڑا اسکی بھیگی آنکھوں کو دیکھتا رہ گیا۔ میرے اندر ایک نامعلوم تلاطم اُمڈ آیا اور پھر حیرانگی و مایوسی کے عالم میں اسکے بیٹوں کے ناروا سلوک کا بوجھ لئے اُسے بناء کچھ کہے سنے چپ چپ آگے بڑھا۔

............☆☆☆............

چھپا رُستم

تڑاخ......!

کلیم کی بات پر وہ نہ صرف چونکی بلکہ اس کی ہلکی سی ہنسی پر قدرے حیرت بھی ہوئی اور وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھتی رہ گئی۔ سنی سنائی بات پگھلے سیسے کی طرح اُس کے کانوں میں اترتی چلی گئی اور وہ طیش میں آ گئی۔

اُس نے اٹھ کر آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک زوردار تھپڑ کلیم کے گال پر کس کے مارا اور اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔

تھپڑ کی زبردست آواز ایسی دلخراش تھی کہ اُس کے منہ سے ایک چیخ گونجتی ہوئی بند کمرے کی اونچی اونچی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی گم ہوگئی اور جس کی جلن سے کلیم کی روح تڑپ اٹھی۔ آصف علی دوسرے کمرے میں ٹی وی دیکھنے میں محو تھا۔ باہر پارک میں محلے کے بچوں نے آسمان سر پر اٹھائے رکھا تھا۔

کلیم نے غلطی ہی کیا کی تھی......؟ جو پروین کو ناگوار گزری اور آپے سے باہر ہوگئی۔ ابھی وہ کم سن اور ناسمجھ ہی تھا۔ یہی کوئی دس گیارہ سال کی عمر تھی۔ یہ سوچ کر وہ کھیل کا میدان چھوڑ کر آ گیا کہ ایک نئی بات سنانے پر ماں سے چاکلیٹ نہ سہی تو کم از کم شاباشی تو ضرور ملے گی لیکن اُسے یہ معلوم نہ تھا بات سن کر اُسے پھٹکار ملے گی۔ اس کی ماں کا پارہ ایک دم چڑھ جائے گا۔ پھر اس نے سوچا کہ صرف ایک ہی تھپڑ تو پڑا ہے۔ چلو اچھا ہی ہوا کہ پٹائی نہیں ہوئی۔ وہ چپ سادھے جس جگہ پر کھڑا تھا، وہیں برف کی مانند جم گیا۔ البتہ

درد کی شدت سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں کہ اُف تک نہ کی اور نہ ہی کوئی احتجاج کیا۔ اپنا گال سہلاتا ہوا ماں کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کیلئے اس کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔ چند لمحوں کے بعد ہمت کر کے وہ اپنی جگہ سے ایک دو قدم پیچھے ہٹ گیا کہ پروین نے پوچھا۔

''تم سے یہ بات کس نے کہی ہے؟

''مما۔ میں نے ایسا کیا کہا۔ محلے کے لوگ یہی باتیں کر رہے تھے''

''یہ پوچھتے ہو کہ کیا کہا۔ بری بھلی بات کہنے کا کوئی سلیقہ نہیں۔ پاپا سنیں گے تو کیا سوچیں گے''

''مجھے کیا پتہ۔ اسلام مرزا نے بتایا کہ......''

گھٹی گھٹی آواز میں رک رک کر کہتے ہوئے وہ معصومانہ نظروں سے اُسے تکنے لگا۔ اس کی پلکیں جھک گئیں۔ ہونٹوں پر تھرتھری سی آگئی جیسے ہوا کے جھونکے سے شمع کی لو کانپ اٹھی ہو۔

یہ سن کر پروین تقریباً چیختے ہوئے بول پڑی اور ایک لمحے کیلئے آنکھوں کے ساتھ ہی اس کے لہجے میں غصہ بھی اتر آیا تھا۔

''خبردار! آئندہ ایسی بے ہودہ باتوں سے بچ کر رہنا۔ کتنی بار سمجھایا کہ آوارہ لڑکوں کی صحبت سے دور رہا کرو، ورنہ پچھتاؤ گے''

وہ خاموش ہو گیا اور دل ہی دل میں ماں کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اُس نے کبھی اس طرح اُسے بے وجہ ڈانٹتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

پاس بیٹھی نائلہ جو دیر سے A سے ایپل اور B سے بوائے کا سبق طوطے کی طرح رٹ رہی تھی۔ بھائی کی اس درگت پر دم بخود رہ گئی۔ پیاری سی گڑیا۔ یہی کوئی چار پانچ سال کی رہی ہوگی۔ بڑی نٹ کھٹ اور باتونی تھی......اُس نے من ہی من سوچا کہ ابھی یہی کوئی ایک گھنٹہ پہلے ممی نے اُسے دو ملائی کھلائی تھی اور اب اس کیلئے یہ منظر بڑا کرب ناک

تھا۔ وہ تھوڑی سی گھبرائی اور خوفزدہ سی ہوگئی۔ ایک نظر سے بھائی کو دوسری نظر سے ماں کے چہرے پر بدلتے ہوئے تیور کو دیکھتی رہی۔ اُس نے ماں کا ایسا رویہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دیر تک چپ رہنا اُسے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ بھائی کے پیار میں گرفتار، ماں سے بغاوت کر بیٹھی اور توتلی زبان میں کہنے لگی:

''ممّا! بھیا کو چانٹا کیوں مارا......؟''

''چپ رہ پوچھنے والی۔ اب تم بھی بولنے لگی ہو''۔ یہ کہہ کر پروین نے نائلہ کو چپ کرایا۔

بظاہر وہ نائلہ کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتی رہی مگر بھائی کیلئے اُمڈتا پیار دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ہنس دی جبکہ نائلہ خاموشی سے دیر تک ماں کو گھورتی رہی۔

ادھر کلیم نے بہن کے چہرے پر چھائی جانے والی اداسی کے بادل دیکھے، جانے کیسے اس کا دل بھی پگھل گیا۔ سارا دکھ سمیٹ کر اس نے بھائی کی طرفداری کرتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

''اور پاپا بھی اکثر تمہارے ساتھ جھگڑا کرتے رہتے ہیں اور تو......'' ابھی کلیم اپنی بات پوری نہ کر پایا تھا کہ پروین نے رعب جماتے ہوئے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔

''پھر وہی گندی بات......؟''

اس بار اُس نے اس کے گال پر دوسری چپت ماری ہلکی سی۔ لگا جیسے گال پر کسی نے برف یا روئی کا گالا رکھ دیا ہو......چھٹی کا دن تھا......!

پچھلے پہر سے پروین اپنے کام میں اس قدر منہمک رہی کہ اُسے وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ اُس کے سامنے دھلے ہوئے کپڑوں کا ایک انبار پڑا ہوا تھا۔ ان پر استری کرتے کرتے سارا بدن نڈھال ہوتا جا رہا تھا اور کمر جیسے ٹوٹ چکی تھی کہ اب اُسے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے برداشت کی طنابیں اس کے قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھیں اور اُسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔

جانے اس دن کونسے منحوس خیالات اس کے دل کے گوشے میں چپکے سے آکر بیٹھے تھے کہ وہ کئی نئی نئی باتیں سوچنے لگی تھیں کہ عین موقع پر کلیم نے داخل ہو کر نہ جانے ایسی کونسی بات کہدی کہ اُسے چونکا دیا۔ اور وہ بھڑک اٹھی۔ ویسے بات نہ اتنی سنجیدہ اور تعجب آمیز تھی اور نہ ہی مضحکہ خیز۔ جسے سن کر پروینؔ بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتی اور یوں پھر بستی میں یہ کوئی پہلا انوکھا واقعہ بھی نہ تھا۔ ایسے واقعات ہر روز کہیں نہ کہیں رونما ہوتے رہتے تھے۔ چند دنوں تک لوگوں میں اس کا تذکرہ ہوتا رہتا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جلد ہی اس واقعے کو بھی بھلا دیا جاتا اور پھر اچانک کوئی دوسرا واقعہ یا حادثہ سننے کو ملتا۔

باہر فضا بوجھل اور مکدر ہو رہی تھی اور سارا کمرہ گرم تھا۔ اچانک ان دیکھی گرمی پروینؔ کے شریر میں سرائیت کر گئی اور اس کی دھیمی دھیمی سی آنچ وہ اپنے اندر بھی محسوس کرنے لگی۔ کلیم کے چہرے پر معصومیت دیکھ کر اس کے دل میں ہوک سی اٹھی اور پیار امڈ آیا۔ پھر اس نے جذبات کے رو میں بہہ کر بے ساختہ کلیم کو بانہوں میں سمیٹ لیا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے مرجھائے گالوں پر کئی بوسے ثبت کر دیے پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کنگھی کرنے لگی۔ دراصل اُسے بیٹے کے منہ سے سنی بے تکی بات کہنے پر ایک نامعلوم سی چبھن دل میں محسوس ہوئی تھی۔

کلیم جو ابھی تک گم صم مبہوت سا کھڑا تھا۔ اچانک ہی ممتا کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر نہال ہو گیا جیسے کوئی شگوفہ سورج کی پہلی کرن پڑتے ہی مسکرا اٹھا ہو۔ نائلہؔ بھی بھائی کے چہرے پر بشاشت دیکھ کر پھولے نہ سمائی اور اس کی شرٹ کا دامن پکڑ کر نیچے بیٹھنے کا اشارہ کرتی رہی۔

جب سے پروینؔ بستی کے اس فلیٹ میں رہنے لگی تھی۔ پہلے پہل ایک عرصے تک کافی خوش نظر آ رہی تھی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ہی اُسے اپنی تمام کوششیں رائیگان ہوتی ہوئی نظر آئیں اور اس کا دل اچاٹ گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو کسی کچرے کے ڈبے کے اندر پراگندہ ماحول میں دم گھٹتے پایا۔ اسے کیا پتہ تھا...... سب کچھ سسرال میں چھوڑ کر یہاں اس

بستی میں یہ امید لیکر آئی تھی کہ ایک نیا گھر ہوگا۔بچوں کی پرورش اور اچھی تربیت ہوگی۔خوشیوں بھرا آسمان ہوگا وہ جنت کا گمان کرنے لگی تھی۔یہ سوچ کر اس نے اپنے تمام چاندی اور سونے کے زیورات بیچ ڈالے تھے،اور اپنی ساری نقدی جمع پونجی اکٹھے کر کے واڑروب کے اندر کپڑوں میں چھپا کر رکھ دی تھی جسے وہ ایک محفوظ پناہ گاہ سمجھتی تھی۔جس پر اوروں کی نظریں یا کسی چور کا ڈر لگا رہتا تھا۔اس کشمکش میں جب اس نے قیمتوں کا اتار چڑھاؤ دیکھا تو اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا،تب خواب اس کا منہ چڑھانے لگے۔مجبور ہو کر اسے بڑی تگ ودو کے بعد تین منزلہ عمارت میں ایک فلیٹ جو تین کمروں پر مشتمل تھا،رہائش کیلئے مل گیا۔

کولونی کیا تھی......؟

اس میں سرکاری و نیم سرکاری شریف اور بدمعاش ہر قسم کے لوگ آباد تھے۔ عمارت کے سامنے ایک میونسپل پارک تھا۔اس کے آگے دائیں بائیں جانب دور تک ایک ہی قطار میں بہت سی عمارتیں کھڑی تھیں۔پارک ختم ہوتے ہی دکانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔پرلے حصے کے نچلے طبقہ میں لوگوں کی پرانی بستی آباد تھی اور ان کی جھونپڑیوں سے عورتیں فلیٹوں میں آ کر دن بھر گھر کا کام کاج کر کے شام کو اپنے اپنے گھروں میں لوٹ جایا کرتی تھیں۔

عمارت کی پہلی منزل میں کوئی نیا نیا جوڑا رہا تھا۔شاید دونوں ملازم تھے۔اسی لئے ہمیشہ ان کے دروازے پر تالا لٹکتا ہوا نظر آتا تھا اور کبھی کبھار چھٹیوں میں کھلا چھوڑ دینے سے ان کی موجودگی کا پتہ لگ جاتا۔

دوسری منزل میں پروین اور اس کا شوہر اور چھوٹے چھوٹے دو بچوں کی کلکاریاں سننے کو ملتیں جبکہ تیسری منزل کے فلیٹ میں کوئی ادھیڑ عمر کا جوڑا تھا۔معمر شخص ہمیشہ دن بھر کھانستا رہتا اور اس کی بوڑھی بیوی چھت پر آ کر دھوپ سینکتی یا کپڑے سکھاتی ہوئی دکھائی دیتی۔

پرانی بستی کی ایک نچلے درجہ کی سلیمہ نامی عورت وہاں آ کے ان کے کچن میں رسوئی

جھاڑو وصفائی اور بازار سے سبزی وترکاری لانے کا کام کرتی تھیں۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ پروین اپنا سارا کام نپٹا کر بازار جارہی تھی۔ راستے میں اچانک اس کی سلیمہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ شاید کسی کام کی وجہ سے فلیٹ میں جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بڑی باتونی اور چرب زبان تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کسی آشنا کے سامنے کسی اخبار رپورٹر کی طرح خبروں کے ڈھیر لگا دیتی تھی۔ دور سے پروین کو دیکھتی رہتی...... وہ اپنے ہاتھوں کی دو انگلیوں سے کان کی لو پکڑ کر بولی۔

''چھی، چھی! کیا زمانہ آگیا ہے، پروین بیٹی، کچھ سنا، مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں......'' پاس آتے ہی اُس نے اس کے آگے جانے کا راستہ روک کر کہا اور بیچ سڑک اس کے سامنے دیوار کی طرح کھڑی ہوگئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سرگوشی کے انداز میں کسی اہم راز کا افشا کرنا چاہتی تھی۔

تم نے نعیمہ کے متعلق کچھ سنا! یہ کہہ کر اس نے ایک ٹک پروین کے سراپے کا جائزہ لیا اور پھر ناک سکوڑتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

''کل کی چھوکری ''کنجری'' بڑی سیدھی سادی سی لگ رہی تھی۔ آج صبح......''

مائی! جانے دو اُسے۔ اس وقت میرے پاس وقت نہیں۔ اگلی بار سنوں گی......''

پروین اپنی جان چھڑانے کی کوشش میں ایک جانب کھسک گئی لیکن وہ ماننے والوں میں سے کہاں تھی۔ اسکی کلائی پکڑ لی۔ کسی گندی نالی کی مکھی کی طرح پیچھے پڑ گئی۔

''سالے کمینے نے بھی کیا چکر چلایا اور اُسے اپنے موہ جال میں پھنسا کر فرار ہوگیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے روپیوں پیسوں کا لالچ بھی دیا ہو''۔

یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر غصے کی لکیریں ابھر آئیں اور آنکھوں میں دہکتی ہوئی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ پھنکارتی ہوئی بولی۔ ''خدا غارت کرے ان دونوں کو۔ اپنے پیچھے دو دو پلے چھوڑ کر شرم وحیا طاق پر رکھ دی''

ہاں مائی! ان پر خدا کا غضب نازل ہوگا

یہ کہہ کر سلیمٰہ سے جان چھڑانے کے لئے اپنی کلائی کو جھٹکا دیکر اس کا ہاتھ الگ کر دیا۔ تیز تیز وہاں سے بھاگ جانے میں اپنی عافیت سمجھی اور اس کے بلانے پر بھی دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا۔

"نجانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ میم صاحب۔ بات سننے کیلئے فرصت نہیں' پروینؔ کے چلے جانے پر سلیمٰہ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ دور جاتے ہوئے اس کے پھڑ پھڑاتے ہونٹوں سے نکلنے والے ناز یبا الفاظ پر بھی پروینؔ نے کوئی توجہ نہ دی اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

بازار سے واپسی پر اس کا دھیان سامنے آٹو رکھشا کی طرف گیا۔ جہاں ایک چھوٹی سی بھیڑ اکھٹی ہوگئی تھی۔ اس نے وہاں دو نا معلوم مردوں کے درمیان ایک انجانے نقاب پوش خاتون کو کھڑا دیکھا جسے ان دونوں میں سے ایک آٹو رکھشے میں سوار ہونے پر مجبور کر رہا تھا جبکہ دوسرا مرد زبردستی سے ان کی کوشش کو بیکار بنا رہا تھا۔ ہانپتی کانپتی برقعہ پوش خاتون بغل میں کوئی گٹھری دبائے ہوئے دونوں کی بانہوں کی گرفت میں پنڈولم کی طرح جھول رہی تھی۔

پروینؔ نے وہاں زیادہ دیر تک رکنا مناسب نہ سمجھا اور ان کی باتوں سے کبیدہ خاطر ہونے لگی تھی۔ وہ فوراً وہاں سے کھسک جانا چاہتی تھی کہ اچانک ایک باریش بزرگ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"بیٹی! کیا بتاؤں قیامت آنے والی ہے۔ یہ بدچلن عورت اپنے کسی آشنا کیساتھ بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح اس کے شوہر کو اس بات کی بھنک لگی اور اُسے بھاگتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جبکہ وہ دوسرا مرد اس کا حقیقی شوہر ہونے کا دعوی کر رہا ہے۔ بس اسی بات پر ان دونوں کے بیچ میں ٹھن گئی۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کس کی بات سچ اور کون غلط ہے"۔

یہ سن کر پروینؔ کے چہرے پر لاج آگئی۔ اس نے اپنا دوپٹہ درست کیا اور انہیں نفرت سے دیکھتے ہوئے چپ چاپ آگے بڑھی۔

جانے آصف علی اپنے کمرے میں کیا کر رہا تھا اور اس کے کمرے سے باہر نکلتے وقت سلیمہ نے پروین کو سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھا۔ سمجھی کہ اس نے دیکھا ہی نہیں ہے اور یہ سوچ کر وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی تیسری منزل کی سیڑھی کی طرف بڑھی۔ لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی آہٹ پاتے ہی پروین نے اُسے دیکھا تھا۔

پروین جب کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے آصف علی کو اخبار پڑھنے میں محو پایا۔ اس کے پاس وہاں کوئی دوسرا موجود نہیں تھا۔ بچے باہر لان میں کھیل رہے تھے۔ دیکھتے ہی آصف علی نے آنکھوں کے سامنے سے اخبار ہٹا کر متانت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تم آ گئی، کہیں سگریٹ کی ڈبیہ بھول تو نہیں گئی ہو"

"بھلا یہ بھی کوئی بھولنے کی چیز ہے"

اس کے لہجہ میں طنز بھرا تھا جس کا آصف علی نے برا نہ مانا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کی معمولی سی بات پر وہ سگریٹ پینے کے مضر اثرات کی پوری کتاب سامنے لانے میں دیر نہیں لگائے گی۔ پھر اپنا موضوع بدلتے ہوئے کہا

"تو پھر کوئی تازہ اور فریش خبر ہی سناؤ"

ایک لمحے کیلئے وہ اس کی بات پر چونکی، اُس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ سلیمہ نے تو کوئی اوٹ پٹانگ کہانی ضرور سنائی ہوگی۔ خاموش رہی اور زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔۔۔ وہ اس کی کسی بات کا جواب دینے کیلئے بالکل تیار نہ تھی۔ اس کے دماغ میں مردوں کے خلاف آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ تنگ آ کر وہ بولی......

"دن بھر ٹی وی دیکھنے اور اخبار پڑھنے سے کیا دل بھرا نہیں۔ اب تک......"

ایک سمے تک وہ رک گئی اور اس کے ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ تھماتے ہوئے آگے بڑھی۔ ابھی وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی کہ دوبارہ اس کی آواز سنائی دی۔

"سنا ہے بستی میں آج......" ابھی آصف علی اپنا جملہ پورا نہ کر پایا تھا کہ پروین فوراً بول پڑی"

''بہتر یہ ہے کہ اس معاملے میں کوئی ذکر نہ چھیڑا جائے۔ یہ عورت پوچھے گی تو اُسے شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے مرد پوچھے گا تو اس سے مذاق سمجھا جائے''

پروین کا جواب سن کر وہ ہکا بکا سا رہ گیا اور اُسے ہونقوں کی طرح دیکھتا رہا۔ اس کے جاتے ہی سگریٹ نکالی اور اسے سلگانے لگا۔ پھر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور دیر تک دھوئیں کے مرغولے اڑاتا رہا۔

جانے کیا سوچ کر وہ اٹھ کر دبے پاؤں چل کر واڑروب کی جانب بڑھ گیا۔ کھول کر دیکھا، کپڑوں کو ہاتھ لگایا، اسے وہاں سے کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس کے چہرے پر کچھ دیر تک ہلکی سی مسکان چھائی رہی۔ تب وہ تیزی سے پلٹ کر اپنی جگہ پر آبیٹھا تاکہ پروین کا شک اس پر نہ جائے۔

کچھ دنوں کے بعد جب پروین نے واڈرب کھول کر دیکھا تو اس نے ساری پونجی وہاں صحیح سلامت پائی اور وہ مطمئن ہوگئی۔ اس کے ذہن میں اٹھے ہوئے خدشات یک لخت کافور ہوگئے جیسے اچانک سورج نکلنے پر بادلوں سے بھرا مطلع صاف ہوگیا ہو۔

پھر ایک دن اُسے یہاں تک پتہ نہ چلا، کب موہ جال میں پھنسا ہوا پرندہ بند مٹھی سے اڑ گیا۔ کب پاکیزہ رشتہ کی ڈوری سے الگ ہوکر وہ اس کی زندگی اجیرن بنا بیٹھا۔ بھلا ہو سلیمہ کا جو اپنا سینہ نوچتی ہوئی پروین کے پاس یہ نامراد خبر سنانے پہنچ گئی اور آنسو پونچھتے ہوئے دلاسہ دینے کے انداز میں بولی۔

''پروین بیٹی! یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ سنا ہے آج صبح تڑکے آصف علی مولوی صاحب کی بیٹی درخشاں کو بہلا پھسلا کر بھگا لے گیا۔ اتنا ہی نہیں، کم بخت درخشاں اپنے ساتھ مولوی صاحب کی بھاری نقدی اور زیورات بھی ساتھ لے گئی۔ سلیمہ نے کچھ دیر تک اپنی پھولتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''میں نے ابھی گھر کے دروازے پر مولوی صاحب کو اپنی داڑھی نوچتے ہوئے دیکھا ہے''

یہ سنتے ہی چند لمحوں تک پروینؔ ساکت و جامد ہو کر رہ گئی جیسے کوئی زہر ہیں۔ بجھا ہوا تیر اس کے جگر کے آر پار ہو گیا ہو۔ اُسے جاگتی آنکھوں سے ان دیکھے خوابوں کی لڑیاں ایک ایک کر کے بکھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ سنبھلی تو ہڑ بڑا کر بے ساختہ دھیمی آواز میں بڑبڑانے لگی۔

''خس کم جہاں پاک''

سامنے بیٹھا کلیم جو ماں کے چہرے کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ سوچنے لگا، اس دن ماں میری ایسی ہی بات پر نادم و خفا ہو کر مارنے پر اتر آئی تھی۔ اب جبکہ سلیمہؔ نے بات کہی تو وہ نہ دل برداشتہ ہوئی اور نہ اس پر ہاتھ اٹھایا۔

''کیا وہ سلیمہؔ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتی تھی''

وہ زور زور سے چلانا چاہتا تھا مگر یہ کیا۔ کوئی چیخ اس کے منہ سے باہر نہ نکلی......وہ دم بخود ہو کر رہ گیا اور دیر تک پھٹی پھٹی نگاہوں سے انتظار کرتا رہا۔

پر کوئی ہاتھ اٹھا ہی نہیں......!!!

............☆☆☆............

"سیندور کی لکیر"

مورتی بنانے کا آرڈر آصف علی نے چند دن پہلے لے رکھا تھا۔ پچھلے دو دن سے دن رات اس پر کام کرتا رہا۔ اب کام لگ بھگ مکمل ہونے کو تھا۔ البتہ جو تھوڑا سا کام ادھورا رہ گیا تھا۔ آج اُسے پورا کرنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا۔

مگر جیسے ہی زبیدہ کے پیٹ میں بے اعتبار انٹھیں اٹھنے لگیں۔ وہ شدت درد و کرب سے بے حال ہو رہی تھی۔

پھر جونہی کوئی مروڑ اُٹھتا وہ بے اختیار چیخ پڑتی۔ سارا معاملہ گڑ بڑ ہو گیا۔ ساتھ ہی ایک اچھا خاصا موڈ بھی خراب ہو گیا۔

"اب پہلے کسے نپٹا لوں؟" ......اگرچہ زبیدہ کے اندر ایک اضطراب تھا جو کسی پل اُسے قرار نہیں لینے دیتا۔

بڑی متانت سے آصف علی کا ہاتھ دبا کر بولی۔

"گھبرانے کی بات نہیں۔ کیونکہ پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"مگر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" آصف علی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"اتنی فکر ہے تو فوراً دایہ حلیمہ کو بلاؤ"

یہ سنکر وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ دوڑتے دوڑتے دایہ حلیمہ کے پاؤں پر گر کر کافی دیر تک گڑگڑاتا رہا اور منت سماجت کرنے لگا۔ وہ کسی نازک جھکی شاخ کی طرح نرم پڑ گئی اور اسکے ہمراہ آنے پر تیار ہوئی۔

دائی حلیمہ مزاج کی بڑی تیز تھی مگر جب معاملہ دیر پا یا پیچیدہ مسئلہ کھڑا ہو کر دیکھتی تو فوراً دوڑ کے چلی آتی۔

چونکہ یہ علاقہ شہر سے کافی دُور تھا اور حکومت کی سہولیات سے محروم رہ گیا تھا۔ بستی کے آس پاس کوئی ڈسپنسری موجود نہ تھی اور نہ ہی کوئی معقول اِنتظام اور بندوبست تھا۔ لہٰذا پرانے رسم ورواج اور تشخیص کے مطابق وعلاج معالج ہو رہا تھا۔ اس معاملے میں وہاں کئی معزز اور ماہر عورتوں میں سے دایہ حلیمہ ہی واحد وہ عورت تھی جو بحیثیت دایہ کے طور پر ایسا کام انجام دے سکتی تھی۔

زبیدہ بستر پر درازِ دروزہ میں مبتلا تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں موتیوں جیسے چمک رہی تھیں اور دل کی دھڑکنیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ ایک عجیب سی بے چینی اُسے مسلسل چبھ رہی تھی جس سے آنکھیں نم ہوگئیں تھیں اور اُسے کسی پل چین وسکون نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ پھر جیسے ہی پیٹ میں بے اختیار انٹھیں اُٹھتیں تو بے حال ہو کر کراہنے لگتی اور اسکے منہ سے دبی دبی ہلکی ہلکی سی چیخیں نکل جاتیں۔

وہ سِسک سِسک کر دائی حلیمہ کے بازو پر سر رکھ کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھا کرتی۔ اپنے آپ سے بڑبڑاتی رہتی۔ کبھی خود کو بُرا بھلا کہنے لگتی۔ کبھی الٹے سیدھے لہجے میں بے تکی باتیں اور الٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہتی۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ اچانک کوئی خیال اسکے ذہن میں بجلی کے موافق کوندا اور رگ وپے میں اُتر گیا تو اسکی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک پیدا ہوگئی۔ ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ چند لمحوں میں ایک ہفتہ پیچھے چلی گئی۔ جب اُس نے خواب میں کسی باریش بزرگ کے سامنے آصف علی کو دوزانوں بیٹھے اسکے کندھوں پر ایک کبوتر منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔

گوابھی اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہ ہوا۔ جب اُس نے خواب میں باریش بزرگ کو دیکھا۔ جس نے اس بار بیٹا ہونے کی بشارت دی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے اسکے دل ودماغ پر

ایک غیبی طاقت کا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا۔

سرہانے بیٹھی دایہ حلیمہ جو حیران و پریشان اور تکان کی وجہ سے کوئی جواب دے نہیں پا رہی تھی۔ سوائے اسکے پھلوں کے رس کی چسکیاں پلا دیتی۔ متلی آجانے پر اسکی پیٹھ پر ہاتھ پھیر لیتی اور کبھی کبھی میٹھی میٹھی باتوں سے تسلی دیتی تو کبھی ہسنے ہنسانے کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔

سارا گھر اداسی کی پرتوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دُور بیٹھا کمرے کے ایک کونے میں آصف علی سر نہوڑے کسی سوچ میں ڈوبا تھا۔ سامنے اسٹو (stove) پر کیتلی کے اندر پانی اُبل رہا تھا۔

"یونہی کب تک بیٹھے رہو گے۔ ذرا کچھ لاج و شرم کر۔ بے تمیز، بے شرم کہیں کے۔ کوئی کام دام نہیں رہا ہے۔"؟

"دفعتاً دائی حلیمہ کے ذہن میں کونسا خیال آیا۔ جھٹک کر آصف علی کو کمرے سے باہر نکلنے کے لئے کہا۔

بچارا! آصف علی سیدھا سادہ آدمی تھا۔ شریف النفس بھی مگر محنتی ضرور تھا۔ اپنی بیوی کے قرب میں رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ شرم وحیا سے اسکے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں اور وہ وہاں سے اُٹھ کر فوراً چلا گیا۔

بچپن سے ہی آصف علی کھیتوں کے منڈھیروں پر یا چنار کے درخت کی چھاؤں میں مٹی کے کھلونے بنانے کا شوقین تھا۔ آس پاس کوئی درسگارہ یا مکتب نہ تھا اور نہ ہی پڑھنے پڑھانے کا کوئی معقول ذریعہ تھا۔ بچے زیادہ تر صبح سے شام تک بھیڑ بکریاں اور مویشی چراتے تھے اور بالغ عمر کے لوگ اپنے ہی آبائی پیشے سے منسلک ہو کر اپنی روزی روٹی کما لیتے تھے۔

اُس نے ہوش سنبھالتے ہی پہلے پہل سنگتراشی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ بعد ازاں مورتیاں بنانے کی طرف راغب ہو گیا۔ بچپن کی عادت اور شرارت ابھی چھوڑی نہ تھی۔ گھر

کے اندر ایک کمرے کو کارخانہ کی شکل دیدی۔ فرصت کے لمحات میں وہاں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے کھلونے اور مورتیاں بنانا شروع کردی تھیں۔

زندگی ایک تماشہ ہے.......

کبھی کوئی اسکے اشارے پر ناچتا ہے کبھی خود کسی کے اشارے پر ناچتا ہے۔ چونکہ یہ سمجھنے والی بات ہے۔

آصف علی کی زندگی میں جس چیز کی کمی رہ گئی تھی وہ بھی اللہ میاں نے ایک پری کی صورت میں عطا کی تھی۔ بالکل وہ کشمیری دیہاتی الھڑ دوشیزہ تھی۔ جو سرو قد بھی تھی۔ ماہتابی چہرہ، بادامی آنکھیں۔ پلکوں کے اوپر گھنے جنگل جیسی بھویں اور سیب کے ترشی ہوئی قاشوں کی طرح ہونٹ سرخ تھے۔

حسن اتفاق سے ایک دن اس نے ایسی حسین وجمیل مورتی بنائی کہ جسے ایک بار کوئی دل پھینک عاشق مزاج دیکھ لیتا تو وہ منہ مانگی قیمت دینے پر راضی ہو جاتا۔ خوشی کی مستی میں زبیدہ کو پاس بلا کر سر پر اپنی میلی کچیلی سی ٹوپی کی نوک سیدھ کر کے بڑے مفکرانہ انداز میں بولا۔

''ادھر آؤ زبیدہ بیگم! دیکھو کیسی خوبصورت مورتی بنائی ہے میں نے''......اُس نے اپنی پھٹی پرانی قمیض کے آستین سے مورتی کو صاف کر کے اسکی طرف بڑھادی۔

''واقعی لاجواب ہے یہ۔'' وہ داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔

''ارے پگلی! تیری جان کی قسم، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ کریم بخش ضرور خرید لے گا''

''کیا وہاں وہی ایک دکاندار رہ گیا ہے اور بھی کسی کو دکھانا۔''

فرط مسرت سے مورتی کو اپنے مہندی رنگے نازک ہاتھوں میں لے کر زبیدہ جھومنے لگی۔

''انمول گڑیا۔ پری جیسی لگتی ہے۔''

''بالکل تمہاری جیسی ہے نا۔'' یہ کہتے ہوئے آصف علی نے اسکے ماتھے پر اپنی محبتیں ثبت کرنے لگا تھا۔ مارے خوشی کے اُسکے قدم زمین پر نہ پڑ رہے تھے آخر اپنی ٹوپی کو سر سے اتار کر ہوا میں اچھالتے ہوئے کوئی کشمیری گیت گاتے ہوئے کمرے سے نکل پڑا۔

اُس دن آصف علی بے حد مسُرور تھا۔ صبح اٹھ کر پہلے مورتی کو کاغذ کے پلندے میں ملفوف کیا۔ اس کا دل مورتی کو بیچ ڈالنے کے لئے مچل رہا تھا۔ اس نے گھر پر ہی بلیوارڈ کے ایک جانے پہچانے دکاندار کے پاس جانے کا ارادہ کرلیا۔ جو وقتاً فوقتاً اسکے بنائے ہوئے پرندوں کے مجسمے اور مورتیاں خرید لیا کرتا تھا۔

جلدی جلدی سے ناشتہ کر کے وہ اُجلے دھلے کپڑے پہن کر شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ شہر آکر بلیوارڈ سڑک پر کہیں جارہا تھا۔ کسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک سامنے سے آرہا ایک غیر ملکی سیاح سے جاٹکرایا۔ یہ تو قسمت اچھی تھی کہ گرنے سے بال بال بچ گیا۔ مگر بغل میں دبائی ہوئی مورتی چھوٹ کر دوُر سڑک پر جاگری۔

سیاح خفیف سا ہوگیا۔ آگے چند قدم آگے بڑھا اور پھر بند پیکٹ سڑک سے اٹھا کر اسکی طرف بڑھا دیا۔ ''سوری! چوٹ نہیں آیا۔؟'' ...... پھر اسی انداز میں ''تھنکس گارڈ'' کہہ کر جھٹ بول پڑا۔

''اوہنہ!'' ...... یہ کہہ کر آصف علی نے لمحہ بھر اسکی طرف دیکھا۔ مورتی کا خیال آتے ہی اخبار کا تہہ کھول دیا اور اچھی طرح سے دیکھا پرکھا۔ مطمئین ہو کر وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔

سیاح نے جب حیران حیران سی نگاہوں سے چمکتی مورتی دیکھی تو اسکی کاریگری کے آگے ہوش کھو بیٹھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھرتے ہوئے ایکدم بولا۔ ''کیا دام مانگتا ہے۔ جتنا مانگتا' میں دینے کو تیار ہوں'' ...... اس نے بناء چھوئے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا۔

آصف علی حیرت سے اسکا منہ تکتا رہ گیا۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ چشم زدن

میں چمکتا ہوا سورج جیسے اسکے ہاتھ میں آ گیا ہو۔ یہ تو اسکی فنکارانہ مہارت کا کرشمہ تھا۔ اسکی محنت کا صلہ اور کچھ قسمت کا کھیل بھی.........

اُس نے آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں اور دل ہی دل میں خدا کی عظمت بیان کرنے لگا۔ اتنے میں دُور کسی مقامی مسجد شریف سے اذان کی گونج سنائی دی۔

''پانچ ہزار!'' ____ وہ بے ساختہ جیسے چیخ پڑا اور لفافہ بند پیکٹ سیاح کی طرف بڑھا دیا۔

وہ بار بار اپنا ہاتھ مورتی پر پھیرتا رہا اور داد بھی دیتا رہا۔ جیسے کوئی بچہ من پسند کھلونا ملنے پر خوش ہوتا ہے۔ اُس سے رہا نہ گیا۔ خوش ہوکر اپنی زبان میں بولا۔

How a genious artist you are!

Wonderful --- I like it.

آصف علی اسکی بات سنکر جیسے سناٹے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر تک کسی ہونق کی طرح گُھور گُھور کر دیکھتا رہا۔ بچارا! غیر ملکی زبان سے نابلد تھا۔ ان پڑھ اور گنوار بھی۔ وہ اسکی زبان سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ فوراً ہی وہ تذبذب کا شکار ہوا۔

چند لمحوں تک من ہی من میں اپنی حماقت پر پچھتاتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔

''منہ مانگی دام نہ بتائی ہوتی تو آج کا یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ نجانے اب اسکا کیا انجام ہوگا۔''

یہ سوچ کر وہ اسقدر گھبرایا کہ اسکا وہاں ٹھہرنا اب مشکل ہو گیا اور پھر وہیں مورتی چھوڑ کر بھاگنے کا بھی ارادہ کر لیا۔

جبکہ سیاح ایک نظر آصف علی اور ایک نظر مورتی پر ڈالتا تو جیسے اُسے دُنیا کا آٹھواں عجوبہ ہاتھ لگا ہو۔

ادھر آصف علی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اسکے جسم کی بوٹی بوٹی بھن کر اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے۔ ''O.K. (او۔کے) کوئی بات نہیں، دیتا ہوں''

سیاح نے زیرلب مسکراتے ہوئے بٹوہ نکالا اور ہزار کے پانچ نوٹ اسکے ہاتھوں میں تھمادیئے۔اور پھر تشکر کی نظریں ڈال کر آگے بڑھا۔

آصف علی ہکابکا دیکھتا رہ گیا۔اسکے اندر خوشی کا فوارہ پھوٹ پڑا اور سوچنے لگا'' کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔''؟

تھوڑی دیر تک آصف علی اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔یہاں تک کہ وہ سڑک پار کر کے سامنے والی بلڈنگ میں داخل ہو گیا اور آنکھوں سے اُوجھل ہوتے ہی اپنی ٹوپی کے نیچے کھوپڑی کُجلائی۔پھر وہ وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

دیکھتے دیکھتے آصف علی کی قسمت جاگ اٹھی تھی۔بلیواڈ کے دکاندار حلقوں میں بات مشہور ہوگئی کہ آصف علی نے ایک پتھر کی مورتی پانچ ہزار میں فروخت کردی ہے۔جب یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تو پلک جھپکتے ہی اسکے آنگن میں برسات کی بارش کی طرح آرڈر برس پڑے۔قدرت کا کرشمہ یہ ہوا کہ اُسے بہت دنوں کی غریبی، تنگدستی، مفلسی اور بے چینی سے نجات ملی اور اعتماد کی لہر شایانوں میں دوڑ گئی۔اُدھر اسکے اندر کوئی چھپا ہوا فنکار جاگ اٹھا۔ادھر دوُر دوُر تک اسکی کاریگری کا ڈنکا بجا۔اُس نے ایک سے ایک بڑھکر بڑی مورتیاں بنانا شروع کیں۔قدرت نے اسکے ہاتھوں میں ایسا جادُو بھر دیا کہ لوگ حیرت سے دانتوں تلے انگلیاں دبانے پر مجبور ہو گئے۔

اس طرح جیسے تیسے گھر کا پہیہ چلتا رہا۔مگر جاڑے کے موسم میں چھت سے بارش کے قطروں کا ٹپکنا بند نہ ہوا۔برسوں سے اسکی مرمت ہو نہ سکی اور یہ خلش اسکے دل میں سوہانِ روح بنی رہی۔

چند دن پہلے کی بات ہے شہر کے ایک معروف و رئیس تاجر کمل رائے اس کے پاس ملنے کیلئے آ گئے اُس نے اپنی بیٹی کے جنم دن پر نادر مورتی دینے کی خواہش ظاہر کی۔وہ اسکی لاڈلی بیٹی تھی جو اسے از حد پیار کرتی تھی۔سارا معاملہ طے پایا گیا البتہ ایک ہفتہ کی مہلت مانگی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ اس قدر کام میں مہنمک رہا جیسے اسکے سر پر بھوت سوار ہو گیا تھا اور پھر پورا ہفتہ ایک ایک کر کے یوں چٹکی بجاتے گزر گیا کہ اب آخری دن رہ گیا تھا۔

وہ زبیدہ کو وہیں اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے کارخانے میں آ گیا اور پھر دیر تک کھڑا سامنے مورتی کے سراپا کا جائیزہ لیتا رہا۔ جوں جوں ایک ایک پل گزرتا رہا۔ اسکے دماغ میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس آزمائش کی گھڑی میں اسکی زندگی داؤ پر لگ چکی تھی اور اُسے کچھ سُوجھتا نہیں تھا۔

پاس مورتی مخمور آنکھوں سے ایسی تکتی جاری تھی جیسے اچانک اسکے وجود میں کوئی روح حلول کر گئی ہو، ہونٹوں پر جیسے مسکراہٹ رقصاں تھی۔ بس حیرانگی کی بات یہ تھی کہ ماتھے پر سندور لگانے کی لکیر کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ جسے بنانے اور تراشنے کیلئے آصف علی کافی متفکر تھا اور اس سبب سے کام اُدھورا پڑا تھا یا یوں سمجھو کہ اس وجہ سے مورتی ادھوری سی لگ رہی تھی جس کے بغیر وہ کوئی بیوہ سی لگتی تھی۔

کمرے کے ایک بڑے میز پر چھوٹے بڑے پتھر کے بہت سے بے ترتیب ٹکڑوں کے علاوہ چند آہنی آلات جن میں دو الگ الگ سائیز کے ہتھوڑے اور ایک چھنی بھی تھی۔ ایک رنگدار مارک لگانے کا ڈبہ بھی تھا۔ اُن سب چیزوں سے الگ تھلگ سامنے مورتی درمیانی حصہ پر رکھی تھی۔

آصف علی نے ہاتھ میں چاک کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ اسکے نوک دار سرے سے ٹھیک ماتھے کے درمیانی حصہ پر ٹکیہ جیسا نشان لگا دیا۔ پھر ایک پتلی سی لکیر ماتھے سے اوپر کھوپڑی کے پیچھے تک کھینچ لی۔ جو سر کے بالوں کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کر گئی جسے دیکھتے ہی سندور لگا دینے کی جگہ ظاہر ہو رہی تھی۔ جگہ کا تعین کا صحیح اندازہ کر کے ایک ہاتھ میں ہتھوڑا اور دوسرے میں چھنی کی مدد سے تراشنے میں مشغول ہو گیا۔

ابھی وہ کام سے فارغ نہ ہوا کہ دوسرے کمرے سے زبیدہ کے کراہنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ آواز اتنی اونچی تھی جیسے اسکے دماغ پر کوئی زُور زُور سے ہتھوڑا مار رہا ہو۔ چند

ساعت ایسے گزرے کہ اس نے اپنے ہاتھ روک کران کی باتیں سننے کی کوشش کی جو دائی حلیمہ اورزبیدہ کے درمیان ہورہی تھی۔

''بیٹی ! صبر سے کام لے۔اس نازک گھڑی میں عورت کو درد سہنا ہی پڑتا ہے ورنہ کیسے وہ دیوی یاماں کارتبہ حاصل کرسکتی ہے۔

''کیا اسکے بغیر ایک عورت ماں کا درجہ پانہیں سکتی ہے؟''

''یہ تو قدرت کا نظام ہے کیا بانجھ عورت کو بھی ماں کی صف میں کھڑا دیکھ سکتی ہو۔''

دیکھنے میں وہ مورتی پر ہتھوڑا چلارہا تھالیکن اصل میں زبیدہ کے خیالوں میں گم تھا۔اُسے اُن کی فلسفی باتوں سے کوئی سروکار یا دلچسپی نہیں تھی۔اس کی نظریں نئے مہمان کو دیکھنے کی منتظر تھیں۔اورسماعت ننھی معصوم سی چیخ سننے کے لئے بیقرار....

کچھ لمحے ایسے گزرے پھرایک خاموشی چھائی رہی۔جیسے سمندر مدو جزر پیدا ہونے سے پہلے بے سدھ دکھائی دیتا ہے۔

آصف علی ضربوں پرضربیں لگارہا تھا۔اس کا عمل پانی پر چابک مارنا جیسے تھا۔ باوجود کوشش کے سندور کی لکیر صاف طور پر نمایاں نہیں ہورہی تھی۔کہیں نہ کہیں ایک سیدھ میں ہونے کی بجائے مڑتی ہوئی نظرآرہی تھی۔

پھر جب اس کمرے میں خاموشی کو چیرتے کسی نوزائیدہ بچہ کی پہلی چیخ سنائی دی جو چند ساعتوں کے بعد خود بخود فوراً بند ہوگئی اور دیر تک وہاں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ آصف علی کو ہوش نہ رہا۔اُسکی آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ ہیولا پھیل گیااور ہتھوڑا بے تحاشہ ماتھے کے اس حصے پراس زُور سے پڑا کہ پیشانی کا اگلا حصہ جہاں ٹیکے کا نشان تھا اکھڑ کر نیچے زمین پرآگیا۔

............☆☆☆............

شش و پنج

ٹن۔ٹن۔!

میز پر پڑا موبائل بج اٹھا اور کمرے کے اندر عجیب سی ہلچل نمودار ہوئی......

وہ اس قدر مطالعے میں محو تھی کہ اپنے حال اور دنیا سے بیگانگی کے سبب ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔بات کرنے کو بالکل تیار نہ تھی۔ورنہ عام دنوں میں گھنٹوں بھر پرندوں کی طرح چہکارتے ہوئے تھکتی نہ تھی۔یوں اس حالت میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کال ریسو Receive کرنا اس کے لئے کوئی دشوار کام نہ تھا۔

تھوڑے وقفہ کے بعد پھر فون بج اٹھا اور دیر تک مسلسل بجتا رہا۔

اس کا اچھا خاصا موڈ خراب ہو گیا۔اس سے رہا نہ گیا۔غصے میں سکرین کے نمبرات بنا دیکھے پرکھے موبائل بند کر دیا۔البتہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اتنا ضرور کہا......"اونہہ!"

اس اُونہہ میں نفرت اور غصے کا سمندر موجزن تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لفظوں کے سیلابی ریلے میں بہہ کر کافی دور تک جا نکلی ہو اور پھر اپنے وجود کو لہروں کے حوالے کر کے ہر شے سے بے نیاز ہو کر رہ گئی ہو۔

شاید کہانی بڑی دلچسپ تھی۔ابھی اُس نے پوری کہانی ختم نہیں کی تھی کہ اُس کی مخمور جیسی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔چہرے پر تفکرات کے بادل منڈلانے لگے تھے۔دماغ میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔اچانک موبائل دوبارہ بجنے لگا۔

کچھ ساعتوں کے بعد اُس نے جھلا کر موبائل ہاتھ میں لے لیا اور قدرے سنبھل

کر نمبر دیکھا۔ دیکھتے ہی نروس ہوئی۔ نمبر کسی غیر شناسا کا تھا۔ اپنے دماغ پر زور ڈال کر خود سے سوال کر بیٹھی۔

''کون ہو سکتا ہے؟''

وہ چند لمحوں تک تذبذب کا شکار ہوگئی اور سوچ کر گہرائی میں ڈوبتی چلی گئی۔ نیچے بہت نیچے۔ انتک گہرائی تک...... دفعتاً دوسری جانب سے کسی کی نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔ کوئی غیر شناس عورت اس سے مخاطب تھی۔ اس کی حالت غیر سی ہوگئی اور چہرے پر تجسس کے آثار نمودار ہونے لگے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا......

''ہیلو! میں نیلوفر بول رہی ہوں۔ تم مجھے جانتی نہیں ہو۔ پر میں تمہارے متعلق سب جان چکی ہوں اور یہ بتانے پر مجبور ہوگئی ہوں کہ کہیں تم......'' اُس نے بات اُدھوری چھوڑی۔

آواز میں تھوڑی سی لرزش تھی اور بات بھی گول مول سی کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی اہم راز کا افشاء کرنا چاہتی ہو۔

''کیا جانتی ہو میرے متعلق، ذرا میں بھی تو سنوں'' ...... یہ سن کر نجمہ نے اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر شرارت بھرے لہجے میں پوچھا اور ایک لمحہ کے لئے حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈولتی رہی پھر دوبارہ بولی۔

''یہ نہیں بتایا۔ آخر تم ہو کون؟''

پوچھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے اس کے شبنمی چہرے پر ناگواری کی پرچھائیاں نمودار ہوگئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اندرون میں اتھل پتھل مچ گئی اور غصہ سے خون کھولنے لگا۔ وہ بے آب مچھلی کی طرح تڑپ اٹھی اور مزید جاننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوگئی......

''سب کچھ بتاتی ہوں پہلے اپنا غصہ تھوک دو۔ پھر کان لگا کر سنتے جانا میری بات کو''۔

''کہو تو سہی۔ بلاوجہ کب تک پہلیاں بجھاتی رہوگی'' ۔اس نے تنک کر پوچھا۔

''مجھے تجھ سے کوئی بیر یا شکوہ نہیں۔ میرا صرف یہ مقصد ہے کہ حقیقت حال سے

آگاہ کردوں اور پھر میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ کوئی کسی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ناچتی پھرے۔ ''میں جب تک اُس کو کیفر کردار تک نہ پہنچادوں۔ دم نہیں لوں گی'' ......

''کس حقیقت حال سے...... کون کس کا کٹھ پتلی بنا ہے اور کسے جہنم رسید کرنا چاہتی ہو میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں، تمہاری یہ بہکی بہکی سی باتیں۔''

''میں نے کہانا، غصہ تھوک دو۔ ساری باتیں سنانے کے لئے ہی فون کیا ہے۔''

اس کا لہجہ کچھ متانت بھرا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کوئی رازدار سہیلی کی طرح بے باک انداز میں ہمکلام ہوئی ہو اور جھجک و احترام بالائے طاق رکھ چھوڑا ہو۔

پھر دیر تک اُن کے درمیان باتوں کا ایک سلسلہ چلتا رہا۔ ایک پوچھتی رہی اور دوسری جواب دیتی رہی۔ جانے کب تک تہہ بہ تہہ رازوں پر سے پردہ اٹھتا رہا۔ جنہیں سنتے ہی نجمہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی جیسے کسی نے روئی کے ڈھیر میں چنگاری بھر دی ہو۔ ساری خوشیاں پاش پاش ہو کر بکھرنے میں دیر نہ لگی اور پھر سب کچھ جیسے راکھ میں مبدل ہو کر خاکستر ہو گیا۔

نجمہ نے ادھر اُدھر نظریں گھمائیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں کوئی سن تو نہیں رہا۔ خوف اتنا حاوی تھا...... کہ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ شرارتی لوگوں کے نرغے میں بُری طرح پھنس کر رہ گئی ہے۔ جس قدر بھاگنے کی کوشش کرتی ہے، اتنی ہی اُن کی گرفت میں کھینچی سی چلی جارہی ہے۔ پانی پر ہاتھ پیر مارنے جیسا عمل تھا۔ یقین کرنا اس کے بس سے باہر لگ رہا تھا...... کسی عورت نے اس کی زندگی جھنجھوڑ کر رکھ دی تھی۔

اور پھر اس عورت کی باتوں میں درد کی شدت کا احساس نمایاں تھا۔ جبکہ حقیقت حال سے بے خبر نجمہ اپنی دنیا میں گم تھی۔ ایک سے ایک زہر سے بھرپور تیر اس کے دل پر آ لگا تھا۔

وہ تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح اُبلنے لگی۔ غصے اور نفرت کی چنگاریاں بھڑکتے ہی اس کے ماتھے پر بے شمار شکنیں اُبھر آئیں۔ اس کی حالت ایک ایسے پھول کی مانند ہو گئی جو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا ہو۔

''ایسا کیونکر ہوسکتا ہے؟ کیا اس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟''

نجمہ آپے سے باہر ہوتے ہی تقریباً چیخ پڑی۔ اس کے سامنے یہ سوال ناگ کی طرح پھن پھیلائے کھڑا بار بار ڈستا جا رہا تھا۔ کچھ توقف کے بعد اُس نے پھر اپنی بات جاری رکھی۔

''یہ جو بتا رہی ہو۔ اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے''

''یقین کرنا پڑے گا۔ وہ حرام خور، سور کا بچہ بستی گنگا میں ہاتھ دھونا چاہتا ہے۔ تم سے قبل میری ساری دھن دولت اینٹھ لی اور اب کسی وحشی درندے کی طرح تمہارے پیچھے پڑا ایک اچھے موقع کی تاک میں بیٹھا ہوا ہے''۔

اجنبی عورت زار زار رونے لگی۔ ہچکیاں لیتے ہوئی آگے بولی۔

''میں کوئی ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔ قدرت کا دیا ہوا۔ ایک اچھی سرکاری ملازمت کر کے بیس ہزار روپے ماہانہ پاتی ہوں۔ اپنا ایک ذاتی مکان بھی ہے اور دو سال کا ایک معصوم بچہ بھی......'' اجنبی عورت کی آواز ست پڑ گئی اور پھر خاموش ہوگئی شاید اچانک موبائل کا رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔

''ہیلو! ہیلو!'' نجمہ چلاتی رہی۔ جب دیر تک کوئی آواز سنائی نہ دی۔ تو اُسے دھچکا سا لگا۔ تھک کر اُس نے آنکھ میچ لیں، جیسے کوئی خوفناک خواب دیکھا ہو۔

چند ساعتوں کے لئے اس کے سامنے ایک مہیب اندھیرا چھا گیا اور آنکھیں پتھرا گئیں جیسے بے نور ہو چکی ہوں یا روشنی سے محروم ہو چکی ہوں۔ اُسے لگا کہ گھر کی چھت اور دیوادیں تاش کے پتوں کی طرح بکھرنے لگیں اور سارا مکان ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو کر اس کے اوپر آ گیا ہو۔

کچھ لمحوں کے بعد جب سارا معاملہ صاف ہوگیا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر سالم اور ساکت و جامد تھی۔ باہر گلی میں خاموشی تھی اور وہ کسی کی آواز سن نہیں پا رہی تھی۔ پھر یہ سوچا کہ کہین ایسا تو نہیں کہ یہ اس کا وہم ہے۔ وہ اپنے دل سے اٹھی ہوک شدت سے محسوس کرنے لگی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اُس نے آج کچن میں معمول کے مطابق وقت سے پہلے ہی اپنا کام نپٹا دیا تھا۔ صبح اٹھ کر بازار جانے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ چونکہ فراغت کی گھڑی میں شاپنگ کرنا، چیزوں کا مول بھاؤ پوچھنا، دیکھنا پرکھنا عورتوں کا فطری عمل ہوتا ہے......وہ ڈرائیگ روم میں کپڑے تبدیل کرنے کے لئے چلی آئی۔ سامنے فرش پر بکھرے کپڑے اور تپائی پر زیورات کے ڈبے کسی محفوظ جگہ پر رکھنے کا خیال آتے ہی آگے بڑھی۔ اچانک اس کی نظر دیوار پر لگی گھڑی پر پڑی۔ دس بج رہے تھے۔ بازار کھلنے میں ابھی پون گھنٹہ کا وقفہ تھا۔ پھر میز پر ایک مقامی اخبار پڑا دیکھا۔ ہاتھ میں لے کر سرسری جایزہ لیا۔ پھر یہ سوچ کر اپنے آپ سے بڑبڑائی۔

''جانے میں ایسی کونسی جلدی ہے۔ کیوں نہ پہلے چند موٹی موٹی خبریں پڑھ ڈالوں۔ دیکھتے ہیں کے آج کیا چھپا ہے۔؟ کون سی نئی خبر آئی ہے''۔

اخبار ہاتھوں میں لے کر کئی سرخیاں پڑھ ڈالیں۔ پھر ورق گردانی کر کے جونہی اس کی نظریں اندرون صفحہ پر پڑیں۔ اُسے یک گونہ خوشی ہوئی اور مچل اٹھی۔ جس سے چہرے پر ایک نئی شادابی اور تازگی چھاگئی۔ نرم پتلے رسیلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بھی کھل اٹھی۔

ایک عرصہ کے بعد اس کا ہر دل عزیز اور محبوب قلم کار کی تخلیق شائع ہوئی تھی۔ حالانکہ اُس نے پندرہ دن پہلے ہی اس کا افسانوی مجموعہ پڑھا تھا۔ دراصل وہ اس کی مداح تھی۔ چند ساعتوں کے لئے یہ بھول گئی کہ اُسے کہیں اور جانا ہے۔ باقی مشمولات کو یکسر نظر انداز کر کے وہ اپنے من پسند قلم کار کی تحریر کردہ کہانی ''روشنی اور سائے'' اشتیاق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھنے لگی۔ کہانی میں ایسی کشش تھی کہ اُس نے آگے دیکھا نہ پیچھے دل و جان سے مطالعہ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

کہانی کی شروعات شہر کے ایک بڑے اور معروف ترین بزنس مین احمد کلیم کی شریک حیات بیگم خانم نامی عورت سے ہوتی ہے۔ جس کی سنگر مال شاپنگ کمپلکس کی دوسری منزل میں قدم رکھتے ہی ایک جانی پہچانی عورت سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے جو سونے کے

زیورات سے لدی پھندی خوبصورت کپڑوں میں سجی کسی اپسرا سے کم نہ دکھائی دیتی تھی۔ بیگم خانم کواس کے سامنے اپنا سراپا ماند اور کم تر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اُسے دیکھ کر وہ بھونچکی سی رہ جاتی ہے اور پیروں تلے کی زمین کھسکتی محسوس کرتی ہے۔ اُسے اس صورت کو نئے رنگ وروپ میں پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔

اس کا نام عالیہ تھا۔ یہی کوئی دو سال قبل اس کے گھر میں بطور ملازمہ کام کرتی تھی۔ گھر کی ساری ذمہ داری اُس کے کندھوں پر تھی۔ دونوں میاں بیوی کا دل جیت کر اُس نے اس قدر اعتماد حاصل کر لیا تھا کہ گھر کے جھاڑ و صفائی سے لے کر کھانا بنانے کے علاوہ نجی وارڈ روب اور الماری تک رسائی ممکن ہو گئی تھی۔ نقدی ہو زیورات، مجال تھی کہ اس کی موجودگی میں کوئی چیز گم جاتی یا کسی چور چکے کے ہتھے چڑھ نہ جاتی۔

گو شادی کیئے سات سال کا عرصہ گذر چکا تھا اور بیگم خانم اولاد کی نعمت سے محروم تھی......!

کہتے ہیں نا، چور چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہیں کے مصداق کچھ ایسا ہی واقعہ ایک دن بیگم خانم نے دیکھا۔ عالیہ اپنی اوقات بھول کر اتنی گر گئی کہ بیگم خانم سے رہا نہ گیا اور اُسے بے دھڑک گھر سے باہر کر دیا تھا......

آج اُسے ایک نئی وضع دار شکل وصورت میں دیکھ کر بیگم خانم حیران کر رہ گئی......!

نجمہ سوچنے لگی

اب تک اس کہانی میں کوئی نیا موڑ نہیں آیا تھا اور نہ ہی کوئی لچک پیدا ہوئی تھی۔ بالکل سیدھی سپاٹ تارکول سڑک کی طرح رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

البتہ ایک لمحہ کے لئے نجمہ کو عالیہ کی کردار کشی کی انگنت نمائی ہونے پر تعجب ہوا۔ دل کو ٹھیس لگی۔ اس کے دماغ میں عورتوں کے خلاف آندھیاں چلنے لگیں اور دل میں نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا۔ حالانکہ وہ بذات خود ایک عورت ذات کے پیکر کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔

دراصل اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ بچاری!......ایک جوان دوشیزہ تھی۔ کنواری اور

معصوم تھی ابھی تک اس نے دنیا نہیں دیکھی تھی۔ اس کے خیال میں عالیہ کے شخصیت پر جو بٹہ لگ چکا تھا...... وہ نا تلافی تھا اور اُس کی اُمیدوں کے برعکس تھا......!

حالانکہ تھوڑا عرصہ پہلے نجمہ کے شادی کی بات پکی ہو چکی تھی۔ بیاہ رچانے کا دن مقرر ہو چکا تھا مگر اب جو کسر باقی تھی۔ نئے نئے کپڑے سلوانے کی۔ کچھ تو سلوائے گئے، کچھ سلوائے جا رہے تھے۔ ستاروں سے من پسند اور ماڈرن طرز کے زیورات خریدے جا رہے تھے۔ جو باقی رہ گئے تھے اُنہیں خریدنے کے لئے اب وہ پر تول رہی تھی۔ لیکن اچانک مردوں کی خصلت جان کر اُسے ان کی ذات سے نفرت ہونے لگی۔

کہانی میں تب ایک نئی جان آتی ہے جب بیگم خانم اپنی ملازمہ عالیہ سے سوال پوچھ بیٹھی ہیں۔ ''یہ شان یہ مان یہ خریداری! یہ سب کچھ کیسے آ گیا۔ تمہارے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی...... کہیں چوری ڈاکہ......''

''محترمہ! ایسی بات نہیں......''

عالیہ اس کی بات کاٹتی ہوئی اپنی تعریف وتوصیف میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتی ہے اور خود اپنے شان میں قصیدہ گوئی کر کے بنگلہ کار اور گھر میں تین تین نوکروں کا ذکر چھیڑ کر بیگم خانم کا دل جلا کر راکھ کر ڈالتی ہے۔

مگر وہ بھی چپ رہنے والوں میں سے کہاں۔ وہ مزید کریدتی ہے۔

''کس سے شادی کی تم نے......؟''

پہلے عالیہ ٹال دیتی ہے اور کتراتی ہے اور پھر جب اصرار بڑھتا ہے تو منہ پھٹ انداز میں بول کر بیگم خانم کو زمین کے اندر دھنسا دیتی ہے۔ بیگم خانم کو اس کی بات پر اپنا وجود دو الگ الگ حصوں میں بٹتا نظر آتا ہے۔

اور پھر کہانی جس انداز میں کلائیمکس پر پہنچ چکی تھی۔ اس سے نجمہ کے دل کو ہلکی سی ٹھیس لگ چکی تھی۔ اچانک موبائل دوبارہ بج اٹھا اور وہ پلٹ کر اپنی دنیا میں پہنچ گئی۔

''سوری! ایک ضروری کال آنے کی وجہ سے بیچ میں موبائل کاٹنا پڑا۔ کسی نتیجہ پر

پہنچی کہ نہیں''

اُسے نیلوفر کی آواز دور بہت دور سنائی دے رہی تھی۔

''میں سمجھی نہیں!......'' نجمہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''بے وقوف نہ بن۔ عقل کے ناخن لے میرے پاس اس کے سارے ثبوت ہیں۔تمہارے پاس اپنا لیب ٹاپ ہوتو میں اسی وقت ایک ایک کر کے سارے دستاویزات معہ تصادیر ٹرانسفر کر دیتی ہوں''۔

نجمہ کو لگا۔اخبار میں چھپی ہوئی اب تک کہ کہانی اس اجنبی عورت نیلوفر سے ہُو بہو ملتی جلتی ہے۔جیسے کسی گاڑی کے دو پہیے الگ کر دیئے گئے ہوں۔مگر ایک جیسے اور یکسان ہونے کے باوجود کلائیمکس کے قریب پہنچ کر بھی وہ اپنے انجام سے بے خبر تھی۔

پھر نہ جانے نیلوفر کے ساتھ کیا کیا باتیں ہوتی رہیں جو پگھلے سیسے کی طرح نجمہ کے کانوں میں اترتی چلی گئیں۔اس کا خون منجمند ہو گیا اور تھوڑی دیر کے لئے ساکت وجامد ہو کر رہ گئی۔ چیخ پڑتی مگر آواز گلے سے باہر نہ آسکی۔اس کا گلا رندھ گیا۔پیشانی پر پسینے کی بے شمار بوندیں پھوٹ پڑیں۔ چہرے پر ایک رنگ آتا اور دوسرا جاتا رہا۔آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر بہہ گئے۔

اُس کے تن وبدن میں آگ سی لگ گئی بالکل ایسے ہی جیسے عالیہ کی بات نے بیگم خانم کے دل کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

کہانی کے مطابق قریباً دو سال قبل احمد کلیم نے عالیہ سے چوری چھپے بیاہ رچایا تھا۔جبکہ نیلوفر کا شوہر ایک بچے کا باپ ہو کر اب نجمہ کے ساتھ شادی کی بات پکی کر چکا تھا۔ یہ راز کھلتے ہی نجمہ جیسے پاگل اٹھی اُسے لگا کہ جیسے وہ پہاڑ کی بلند چوٹی سے میچے گہری کھائی میں جا گری ہو جس کی تہہ میں دور دور تک پانی کا نام ونشان نہ تھا......!!!

............☆☆☆............

ڈل کے باسی

اِدھر ڈل جھیل کے کنارے گم صم کھڑا میں، کافی دیر سے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اُدھر ڈل کی خاموش اور پرسکون خوب آلود پلکوں پر کہر کی چادر ابھی تک پھیلی ہوئی تھی۔ آس پاس کے ہرے بھرے باغوں، سرسبز مرغزاروں اور زبرون پہاڑی کے آئے ہوئے پرندوں کی چہچاہٹ یعنی بھانت بھانت کی بولیاں خاموش فضا میں صاف سنائی پڑتی تھیں۔ گویا پری محل کی کوئی پری اپنی سہلیوں کے ہمراہ بڑی آن بان سے جھیل میں نہانے چلی آ رہی ہو اور پاؤں میں پڑے پازیب کی جھنکار سے ہوا بھی رُخ بدل رہی ہو۔

کوہِ سلیمان وسعتِ نظر تک جھیل کے پُر شفاف پانی پر تختِ سلیمانی جیسا ہی لگ رہا تھا۔ جا بجا سبز مخمل کے قتلے میں ان گنت کنول کے پھول نگینے جیسے جڑے ہوئے تھے۔ سبز چادر گھاس اور پتے شبنم کے موتیوں سے منہ دھوئے ہوئے تھے۔ سورج کی پہلی پہلی کرن جب کوہِ سلیمان کی بانیوں سے پھسل کر ڈل جھیل کی آغوش میں اتر جاتی تو ہر سو روشنی اپنے تسلط کے نیزے گاڑھ دیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر ذرہ چمک سا اٹھتا ہے۔ بادِ نسیم کے پُر کیف جھونکوں سے ایسا گمان ہوتا ہے جیسے جنت کے ساتوں پٹ کھول دیئے گئے ہوں۔

دھیرے دھیرے بلیوا ڑ سڑک پر بھاگ دوڑ بڑھ جاتی تو بے تحاشہ دوڑتے ہوئے قدم بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ لوگ دوڑتے، ہانپتے اور دبے دبے قدموں سے چہل پہل کرتے۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ جوں جوں لوگوں کا رَش بڑھ جاتا، سڑک پر گہما گہمی میں بتدریج اضافہ ہو جاتا۔ گرد و نواح علاقوں کے لوگوں کے ساتھ سیاحوں کی خاصی

تعداد بھی شامل ہوتی۔قدرت کی خوبصورتی اور ڈل کی جاذبیت سے محفوظ ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا۔یہی کشش انہیں دور دراز علاقوں سے کھینچ کر لاتی ہے۔

اچانک اس موسم میں تعیز وتبدیل سے گرمی میں نمایاں شدت پیدا ہوگئی۔گرمی کی چھٹیوں کا اعلان ہوتے ہی تمام سرکاری اور نیم سرکاری تعلیمی ادارے بند ہوگئے۔ابھی چھٹی کا دوسرا دن تھا......!

آس پاس کے بچے گھروں سے نکل چکے تھے۔چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ڈل کے کنارے پر جمع ہونا شروع ہوگئیں جو دھیرے دھیرے ایک بڑے مجمع کی صورت اختیار کر گئی۔چہرے خوشی سے ہشاس وبشاش لگ رہے تھے۔کئی شرارتی بچے اسکولی وردی میں تھے۔آسمانی رنگت قمیض اور خاکی نیکر میں دیکھتے ہوئے ایسا گمان ہوتا تھا جیسے وہ اسکولوں سے بھاگ کے چلے آئے ہوں۔خوشی سے مست ہاتھی کی طرح جھومتے پھولے نہیں سماتے۔درسی کتابوں کے بوجھ اٹھانے سے شاید خلاصی پائی تھی یا اسکول کی چار دیواری کی مغزماری سے نجات مل گئی تھی۔آزاد پنچھی کی طرح پھدکتے جارہے تھے۔

نٹ کھٹ شریر بچے گھاٹ پر پانی میں اترنے کے لئے اتاولے نظر آرہے تھے۔کئی ان میں ابھی تک ننگے سر اور ننگے پاؤں ادھر ادھر ٹہلنے میں مشغول تھے۔ایسا ہی موسم ہے جو پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ڈل کی طرف کھینچ لاتا ہے۔دن بھر موج مستی سے دل بہلانا، ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لینا اور بلیواڈ سڑک کی دیوار سے بار بار چھلانگیں لگانا۔آگے جا کر تیرا کی کے مقابلے کرنے پر ختم ہوجاتی تھی۔

بسا اوقات مزا لیتے لیتے دوپہر کا کھانا بھی بھول جاتے۔تب جاکے شام ہوتے ہوتے گھر جانے کی فکر لگ جاتی اور بڑوں سے موٹی موٹی گالیاں سننے کا خیال پڑتا۔مار پیٹ سے خوب تواضع کی جاتی مگر یہ عمر ہی ایسی ہے۔باتوں سے کیا لاتوں سے بھی باز نہیں آتے۔

میں دیر سے یہ دیکھتا رہا۔اپنے آپ کو لہروں پر تیرتا ہوا محسوس کرتا رہا۔کبھی جھیل کی گہرے نیلے نیلے پانیوں میں دھنستا ہوا محسوس کرتا۔کبھی قفس سے چھوٹا ہوا آزاد پرندہ آسمان

کی وسعتوں میں قلا بے مارتا ہوا پاتا۔ ہوا کے دوش پر پنکھ پھیلا کر دُور دُور تک اڑنا چاہتا۔ جہاں سے لوٹ آنا گزیر ہو۔ خود کو اکیلا پاتا تو خوف سے کانپ اٹھتا۔ میں اپنی سوچ سے کافی آگے کہاں تک بھاگ سکتا تھا۔ فوراً پلٹ آتا۔ سوچ کی لگام کو پوری قوت سے کھینچ لیتا تھا۔

بچے لکڑی کے گھاٹ پر جمع ہو چکے تھے۔ گھاٹ کی بناوٹ ایک لمبے چوڑے چبوترہ جیسی تھی۔ ایک سرا بلیوارڈ سڑک سے جا ملتا تھا۔ دوسرا سرا پانی میں استاد کردہ شہتیروں پر کھڑا تھا۔ چبوترے سے لگی سیڑھیاں بھی ڈل میں تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ جیسے کوئی گاؤں کی الھڑ دوشیزہ اترنے کی سعی کر رہی ہو۔

ایسے معاملوں میں صبر کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ جھٹ سے انہوں نے قمیض پاجامے اور نیکر اتار دیئے۔ بالکل الف ننگا...... شرم کس بات پر آتی۔ قیمتی اور مہین کپڑوں کے عادی لوگ اپنے بچوں کے سامنے کھلے طور پر عریانیت کا مظاہرہ کرتے ہیں البتہ اونچے قد کے بچوں کو کیا فکر لگی، جانگیاں پہننے میں خاصی سرعت دکھائی۔ شاید بلوغت کے ظاہر ہونے کا ڈر تھا۔

بچے ڈل کی گہرائی میں اترنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ ابھی کچھ چند ساعت گزرے نہیں کہ کئی نیم برہنہ جسم پانی میں ڈبکیاں لیتے ہوئے نظر آنے لگے۔ دیوار سے چھلانگیں لگانے کا عمل جاری تھا۔ جھیل میں ان تینوں دیوقامت ہاؤس بوٹوں تک پہنچنے تک فتح یابی تصور کی جاتی...... ہاؤس بوٹ کی لٹکی زنجیر یا کسی بھی حصہ پر ہاتھ ثبت کرنا شرط لگی رہتی...... یہ کھیل کا انوکھا طریقہ تھا۔ پانی میں ایک اچھال ایک ارتعاش اور ایک اتھل پتھل ہو جاتی۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ کر دُور دُور تک چلی جاتیں۔ یہاں تک وہ ہاؤس بوٹوں کے پانیوں تک اور ڈل کی کھڑی دیوار سے ٹکرا کر دم توڑتی ہوئی غائب ہو جاتیں۔

ان سب سے الگ چھوٹے چھوٹے بچے کنارے کے قریب غوطہ لگانے میں مصروف تھے۔ وہ ڈبکیاں لگاتے لگاتے گنتی میں الٹ پھیر کر کے ایک دوسرے سے سبقت لینے کی کوشش میں لگے رہتے۔

میں اپنے غصہ کو ہمیشہ چیونگم کی طرح چباتا رہا۔ یہ گُر کہاں سے سیکھ لیا، یاد نہیں آرہا ہے۔ ورنہ کبھی کبھی صبر کا پیمانہ بے قابو ہو جاتا تھا۔ پانی پر بار بار فش اسٹک تیرتی ہوئی نظر آتی، قلابہ سے گوندا آٹے کی ٹکیہ چپکانے کی زحمت اٹھانی پڑتی تھی۔ کتنے دشمن پڑے تھے اس چھوٹی سے بے جان اسٹک کے پیچھے...... بچوں کی شرارتوں سے پانی میں اچھال آجاتا اور ساتھ ہی موٹر لاونچ اور واٹر سیکنگ کی چھیڑ خانی خوب ہوتی رہتی۔ جیسے کوئی دوشیزہ اوباش قسم کے لوگوں کے نرغہ میں بُری طرح پھنس گئی ہو۔

یہ تو صرف ایک بہانہ تھا۔ شاید دیوانگی اس سے کہیں زیادہ نہیں ہوتی۔ گھنٹوں ہاتھ میں اسٹک لئے آنکھیں دور جا چکے ہاؤس بوٹ کی طرف مرکوز ہوتیں۔ ہاؤس بوٹ کے چھت پر اُسے نہ پا کر آتی جاتی لہروں کی ٹکٹکی باندھ کر دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے حسن کی بے پناہ سحر انگیز کشش کے جال میں پوری طرح جکڑ چکا تھا اور اس کے غیر معمولی طلسم کو دیکھنے چلا آتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پہلی نظر میں اس کی طرف کھینچا چلا آیا تھا۔ ایک عجیب سی کشش کی مالک تھی وہ..... کئی دنوں تک بلیواڈ سڑک پر چہل قدمی کرتا رہا۔ ایک اچھی عادت بگڑتے بگڑتے مچھلی پکڑنے کا بہانہ بن گئی۔

مچھلیاں پکڑنا میرا پیشہ نہیں تھا۔ اس کی خاطر کھویا کھویا بے قرار سا رہتا۔ کئی بار ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی پھیکی سی مسکراہٹ میری ناپختگی کا تمسخر اڑاتی ہے۔ وہ اکثر پوچھا کرتی تھی...... ”کیوں جناب.....کوئی مچھلی ہاتھ نہیں لگی کیا......؟“ ...... ”اس کا اندازہ تمہیں خوب ہوگا۔“ میرے جواب پر وہ دیر تک کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ ہنسی سے اس کے رخساروں پر سرخی اور نکھر آتی جو میرے دل میں اتر کر مجھے وہاں روز روز آنے کی ترغیب دیتی۔

”بڑی چیز پانے کی خاطر دل گزیدہ ہونا چاہیئے“

”ثابت کرنا پڑے گا“۔

”کوئی چارہ بھی نہیں ہے اس کے ہوا“۔

''یہ چلینج ہے یا مشورہ؟''

''بزدل کے لئے چلینج ہے ہمت والے کے لئے مشورہ''

ان پڑھ ہونے کے باوجود فہم و فراست اس میں بدرجۂ اتم تھی۔ شاید بچپن سے جوانی تک سیاحوں کے طور طریقہ سے کافی سیکھ چکی تھی۔ کہتے ہیں اچھی بری سنگت سے آدمی کی پہچان ہوتی ہے۔ کتنی بھولی بھالی ہے۔ تیز دماغ رکھتی ہے۔ ہر وقت وہ تتلی بنی قریب آتی ہے۔ ہوا کے معمولی جھونکے سے دور کہیں چلی جاتی ہے۔

ابھی تک بچے اپنی خرمستیوں میں مشغول تھے۔ موٹر لانچ کے چلنے سے ڈل میں سونہ لانک اور روپہ لانک تک اونچی لہریں اٹھتیں کہ دیکھنے والے حیرت زدہ ہو جاتے۔ دُور دُور تک موجیں دائرے بنا کر پھیل جاتیں پھر کناروں سے چمٹ جاتیں گویا نوزائیدہ ماں کی چھاتی سے چپک جاتا ہو۔

بوڑھا مچھیرا ابھی تک ان تین دیو قامت ہاؤس بوٹوں کی سیدھ میں اپنی چھوٹی سی ناؤ میں کنارے کے قریب اپنے خیالات میں منہمک تھا۔ تینوں ہاؤس بوٹ نہرو پارک سے بچاس میٹر دور زبرون پہاڑی کی جانب ہمیشہ موجوں پر ہچکولے کھیلتے رہتے ہیں۔ جیسے چیلیڈ ہوم میں اکثر بچے پالنے میں نظر آتے ہیں۔ کتنا دلفریب منظر دکھائی دیتا ہے۔

بوڑھے کے چہرے کی جھریوں میں کوئی تردّد نہ تھا۔ اس کا اندازہ صحیح ہوتا جب وہ اسٹک سے بندھی ڈوری پانی سے باہر کھینچ لیتا۔ قلابہ میں آٹے کا گوندا چپکا کر جھیل کی گہرائی میں چھوڑ دیتا۔ یہ عمل بار بار اس وقت تک قائم رہتا جب اچانک فش اسٹک کے ساتھ جڑی ہوئی ڈوری ہوا میں قلابہ میں پھنسی مچھلی لٹکی نہ ہوتی۔ وہ کہا کرتا......

''پھنس گئی سالی! بہت تڑپا دیا تھا''۔......اس کی جھریوں میں خوشی کے دریا بہنے لگتے۔ کئی بار اس کو اپنی قسمت پر رشک آتا، اچھلتی کودتی لہریں اس کے کام کو آسان بنا دیتی جبکہ دن بھر دھوپ کی تمازت برداشت کرنے کے بعد پشیمان سا رہتا۔

بوڑھا کب کا جا چکا تھا۔ بچے تھک کر گھاٹ اور جھیل سے لگی دیوار پر کپڑے پہننے

میں مشغول ہو گئے۔ سورج اتھاہ گہرائیوں میں اتر جانے پر بضد نظر آتا تو وہ چھوٹی سی ناؤ میں دیوتا مت ہاؤس بوٹ کے اوٹ سے چپو مارتی ہوئی ظاہر ہو جاتی اور میرے لئے رات کی رانی کنول بنی جیسی نکھر جاتی۔

پیڑوں کے تلے ملگجی چاندنی میں راز و نیاز کی باتیں کرتے۔ اس کے لمس سے میں پگھل کر قطرہ قطرہ بہہ جاتا۔ اس دوران اس کے سوالات میرے لئے سوہانِ روح بن جاتے۔

''بابا سے مل لو۔ چھپا چھپی مجھے پسند نہیں''۔

''مجھ پہ اعتبار نہیں رہا''۔

''اعتبار نہیں کرتی تو ملنے کیوں آتی''۔...... مایوس ہو کر کہتی۔

''ابھی تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ تم وعدہ فراموش نہیں پاؤ گی''...... میں دلاسہ دیتا رہا۔

''میں نے کب ایسا کہا۔ بدنامی کا ڈر ہے''...... وہ تڑپ کر اپنی تشویش ظاہر کرتی رہی۔

یہاں تک کہ وہ پھر ان ہاؤس بوٹوں کے اوٹ میں چھپ کر غائب ہو جاتی۔

آج میں پھر ڈل جھیل کے کنارے پر گم صم کھڑا کافی دیر سے سوچتا رہا۔ کتنے سالوں کے بعد لوٹ آیا ہوں۔ جیسے کئی صدیاں گزر گئی ہوں۔ ڈل بالکل سنسان اور آسیب زدہ دکھائی پڑتا تھا۔ زبرون پہاڑی پر برف کی جگہ بارود نے لی۔ شور و شر، قتل و غارت اور بارود سے نکلے دھوئیں کے مرغولوں سے اس کی خوبصورتی ختم ہو چکی ہے۔ انسانی لاشوں سے جھیل کا شفاف پانی سرخ ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے ہر جگہ موت رقص کرتی نظر آتی تھی۔ ہر کوئی دہشت زدہ تھا۔ تخت کوہِ سلیمان پانی میں دھندلا دھندلا دکھ رہا تھا۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا......!

امسال پھر سورج کی گرمی میں تمازت بڑھ گئی تھی۔ حسبِ معمول سرکاری اعلان ہوتے ہی تمام سرکاری اور نیم سرکاری ادارے بند ہو گئے تھے۔

چھٹی کا دن تھا۔ ذہن کے بند کواڑ اچانک کھل گئے۔ آج میری فش اِسٹک مکمل طور سے بے کار ثابت ہو رہی تھی۔ ڈوری اور اسٹک میں کوئی تال میل دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں قلابہ کو دیکھ کر بھاگ جاتی تھیں۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہو رہا ہے۔ آج

بوڑھا مچھیرا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میرے سامنے کئی نیم برہنہ جسم گھاٹ پر دوڑتے پھرتے نظر آرہے ہیں۔ میری تجسس بھری نظریں بار بار ہاؤس بوٹ کی طرف اٹھتی ہیں۔ ناکام واپس لوٹ کر مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہیں میں دیر تک سوچتا رہا۔ میری سوچ کی کوئی انتہا نہ تھی......!

بچوں نے دیوار سے چھلانگیں لگانا شروع کیں۔ مقابلے کی شروعات ہوئی۔ تینوں میں سے ایک ہاؤس بوٹ کی زنجیر پکڑ لینے یا چھونے کی شرط لگا دی گئی۔ شاید یہ وہی ہاؤس بوٹ تھا جو میری نظروں میں کب کا سما گیا تھا۔ بلیوارڈ سڑک کے فٹ پاتھ پر لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ لوگ سیٹیاں بجا کر خوب مزا لیتے رہے۔ ہر کسی کی نظر ان پر ٹکی تھی۔ مگر میری نظر ہاؤس بوٹ پر ایک چہرے کو تلاش کر رہی تھی۔

''شاباش......! شاباش!......'' کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دے دیں۔

''واہ......رے واہ......کتنا اچھا مقابلہ ہو رہا ہے۔'' اس کا قریبی ساتھی جھٹ سے بولا۔

بچے تیرتے رہے۔ ان کے ارادوں میں عزم و حوصلہ تھا۔ وہ کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتے تھے۔ دفعتاً ایک دلخراش چیخ سے میں چونک پڑا۔ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

''وہ دیکھو، شاید وہ تھک گیا ہے۔ ڈوب رہا ہے''۔

''ہاں! ہاں! وہ ڈوب جائے گا۔'' ایک عورت چلا اٹھی۔

''کوئی تو بچا لے اسے۔'' ......ان کے چہروں پر سراسیمگی پھیل گئی۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، کود پڑا۔ بے خوف میں نے ہاتھ پاؤں ایسے چلائے جیسے کسی پٹے کے ٹوٹنے سے پہیہ گھومتا رہتا ہے۔ ایک شکارہ میں دو سائے تیزی سے چیختے چلاتے میرے قریب آگئے میں نے فطری طور سے بچے پر جست لگا دی تو وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں سینے سے چمٹ گیا۔ دو مرمریں بازوؤں نے میرے جسم کو چھوتے ہوئے بچے کا جسم اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ میری حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں ٹکٹکی

باندھے ہوئے خود کو جھیل کی گہرائی میں ڈوبتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

وہی بہو بہو شکل وصورت فرق اتنا کہ داہنی گال پر کوئی تل نظر نہ آیا۔شاید میرے ہوش اڑ جاتے کہ اس نے پوری قوت سے بچے کو پکڑ کر ناؤ میں ڈال دیا۔اس کوشش میں اس کے ہمراہ فرہنگی کے قوی بازوں کی حصار میں اس کا بدن بُری طرح الجھ گیا...... ''تڑاخ......!'' ایک زوردار تھپڑ فرہنگی کے گال پر اس طرح پڑا۔ ناؤ لڑکھڑانے لگی۔ ''بے شرم! میں ایسی ویسی نہیں ہوں کہ پرائے مرد کی باہنوں میں لپٹ جاؤں''......وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ رہی تھی۔ یہ سن کر میرے بچے کھچے ہوش حواس ساختہ ہونے لگے۔ مجھے ایسا لگا کہ کوئی غیبی طاقت میرے ہاتھ جھیل کی گہرائی کی طرف کھینچ رہی ہے۔گدلے پانی کا ایک گھونٹ بے تحاشہ منہ کے اندر چلا گیا۔ بچہ ناؤ میں بے سدھ پڑا تھا۔ جلدی سے میرا ہاتھ تھام لو۔......یہ جگہ بڑی خطرناک ہے۔کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا ہی رہتا ہے۔میری بہن اپنے نامراد عاشق کی جدائی میں ڈوب کر مری تھی۔ یہ سنتے ہی میں نے اپنے وجود کو جھیل کے آوارہ گھاس پھوس اور ''کھل'' میں بُری طرح دھنستا ہوا محسوس کیا۔ وہ پوری قوت سے مجھے پانی سے باہر نکالنے کی تگ ودو کر رہی تھی اور اس کی ہم شکل دیو قامت ہاؤس بوٹ کے چھت پر نوحہ خوانی کرتی نظر آرہی تھی......!!!

............☆☆☆............

اپنا غم کیا کم ہے

وہ روز کی طرح آج بھی اپنے کسی عزیز سے ملنے گیا تھا۔ اتفاق سے راستے میں بس کے انجن میں تکنیکی خرابی پیدا ہوگئی۔ اُسے لگا کہ وقت مقررہ سے پہلے منزل پر پہنچنے میں دیر ہو جائیگی۔ ایک عجیب سی بے چینی اُسے لاحق ہو چکی تھی۔

وہ عجلت میں بس سے نیچے اترا اور اپنی پوتی کی انگلی تھامے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا محلے میں داخل ہو گیا۔ راستے میں چلتے چلتے وہ بار بار رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے بچی کو کچھ سمجھا تا رہا۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی اُداس تھا۔ جانے وہاں ایسی کیا بات ہوئی تھی جس نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یوں بھی اُسے کوئی تین بجنے سے پہلے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

تھوڑی دُور جا کر اسکے قدم اس تنگ گلی کی جانب مڑ گئے جو اس کے گھر جانے کا نزدیکی رستہ پڑتا تھا۔ ورنہ اکثر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ۔ گاڑیوں کی آمد و رفت اور ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا۔ وہ تخیلات میں گم تیزی سے چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے مڑ مڑ کے پیچھے دیکھتے ہوئے آنے والا ایک شخص نادانستہ اس سے ٹکرا گیا۔ جس سے اس کی تخیلات کی طنابیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اچھا خاصا موڈ خراب ہو کر رہ گیا۔ کراہیت کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں خون اترنا لازمی تھا۔ قریب تھا کہ آپے سے باہر ہو کر اس سے اُلجھ کر برہمی کا اظہار کر بیٹھتا کہ دفعتاً اس شخص کی متانت بھری آواز سماعت سے ٹکرائی......

''معاف کرنا احسان بھائی! میں ذرا جلدی میں تھا۔ خیال نہیں رہا۔''

احسان علی کی ہیبت، اپنے رُوبرو ایک جانی پہچانی صورت دیکھ کر بدل گئی۔ اس

نے زبردستی چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں وکیل صاحب۔ایسی بھی کیا جلدی کہ بے تحاشہ بھاگے جارہے ہیں؟''

''کیا بتاؤں۔ایک سرپھیرے آدمی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔اپنا کوئی متنازعہ کیس میرے سر تھوپنے کے لئے کم بخت ہاتھ دھوئے پیچھے پڑا ہے اور میں جان چھڑائے بھاگا جارہا ہوں۔''

''کیس ہی تو ہے۔لیتے کیوں نہیں؟''

''بھائی! کہتے ہیں نا، کوا چلے ہنس کی چال۔کیس کی نوعیت دم خم والی بھی ہو تو۔ لیکن پھیکے کیس کا کیا مزا۔''

کہتے ہوئے وکیل نے سر جھکائے بیگ کے اندر سے ایک بند لفافہ نکال کر اسکے ہاتھ میں تھماتا ہوا بولا۔

''یہ رہے آپ کے کاغذات، آپ کی ہدایت کے مطابق سب کچھ تحریر کیا ہے۔ بس ذرا غور سے پڑھکر دو دن کے اندر مجھے بھیج دیتا۔''

''جی اچھی بات، ہو سکا تو آج ہی مطالعہ کروں گا اور کل آپکے ٹیبل پر ہونگے۔''

ٹھیک ہے!......وہ آگے بڑھا۔

پاس کھڑی پوتی دیر تک ان دونوں کو حیرت و استعجاب سے دیکھے جارہی تھی۔کم سنی کی وجہ سے وہ ان کی باتیں نہ سمجھ پائی تھی۔اس لئے بے قراری میں اپنے دادا سے پوچھ بیٹھی۔

''دادا جی۔دادا جی! یہ آدمی کون تھا۔؟''

''پتر! یہ رشید انکل اور سلیم انکل کی طرح میرے دوست ہیں۔تم انہیں نہیں جانتی۔''احسان علی نے اس کی بات کی وضاحت کر کے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

سن کر وہ لفافے کو دیکھ کر کسی پرندہ کی طرح چہکتی ہوئی بولی۔

''دادا جی! اس لفافے میں کیا ہے؟''

''کچھ بھی تو نہیں پتر۔اس میں تمہارے کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ورنہ میں تمہیں دیکھنے کے لئے دے نہ دیتا۔لیکن تم اس لفافے کے بارے میں ممی پاپا سے کچھ کہنا نہیں۔یہ میرے ضروری کاغذات ہیں۔تم اپنے دادا کی لاڈلی ہونا۔''......یہ کہہ کر احسان علی نے لفافہ جیب میں ٹھونس کر اپنی رفتار بڑھادی۔

گھر پہونچ کر احسان علی نے بہو کو دلان میں مضطرب ومنتظر پایا تو ایک لمحہ کے لئے اس کی نظروں کی تاب نہ لاسکا۔بہو دونوں کو دیکھتے ہی تیوریاں چڑھائے اٹھ کھڑی ہوگئی۔پوتی کا دادا کے سنگ اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنا اُسے فکروا ندیشے میں مبتلا کردیتی تھی۔وہ ناگوار صورت بنائے چند لمحے انہیں گھورتی رہی۔پھر غصے میں بے قابو ہوکر بیٹی سے مخاطب ہوکر غرائی۔

''کہاں تھی اب تک......؟''

''جواب نہ پاکر وہ شیرنی کی طرح دھاڑی۔

''کہاں مرنے جاتی ہے روز روز۔جینا حرام کردیا ہے''

''بہو!''احسان علی نے اسے سمجھانا چاہا لیکن وہ غصے میں اس کی وضاحت جھٹک کر بولی۔

''رہنے دیجئے۔بزرگی کا خیال تو کیجئے۔لوگ طرح طرح کی باتیں بنائے جاتے ہیں۔''پھر دبے لہجے میں بڑابڑائی۔

''بڑھاپے میں سٹھیا گئے ہیں۔اب کون سمجھائے۔برادری میں ناک کٹنے کی نوبت آئی ہے۔''

اس سے پہلے کہ وہ اس کے جلن پر مزید نشانے داغتی۔منّی نانا کا ہاتھ چھڑا کر دوڑی دوڑی ماں کے ٹانگوں سے لپیٹ گئی۔منّی کو لپٹتا دیکھ کر بہو کا لہجہ بدل گیا۔مزاج میں ایسی شانتی عود کر آئی جیسے آندھی اٹھتے اچانک تھم گئی ہو۔

کچھ دیر احسان علی بت بنا خاموش رہا۔پھر بہو کی باتوں کو یکسر نظر انداز کر کے

بغلیں جھانکتا ہوا اپنے کمرے میں آکر کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح بستر پر گر پڑا۔

تھکان سے بے حال اور نڈھال ہو کر اُسے جس قدر تکلیف ہوئی تھی۔ وہ نا قابل بیان تھی۔ وہ اب اس درد سے نجات پانا چاہتا تھا۔ دراز ہو کر اس نے اپنے سرہانے کے نیچے تکیہ رکھ دیا۔ پنکھا آن کر کے آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر تک وہ یونہی لیٹا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کب نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا کہ اُسے اس بات کا پتہ نہ چلا۔ جب تک وہ سوتا رہا۔ اس کے بدن میں کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ لوٹ آئی تھی پھر جب نیند سے جاگا۔ اس کے بے چین دل کو تھوڑا سا قرار مل گیا تھا۔ چہرے پر عجیب رونق لوٹ آگئی تھی۔ اٹھ کر کوٹ کے اندرونی جیب میں سے وکیل کا لفافہ ٹٹولتے ہوئے باہر نکالا۔ کھول کر دیکھا تو لفافے کے اندر چند کاغذ تھے۔ وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ہر پرچے کی عبارت مطالعہ کرنے لگا اور پھر جہاں جہاں اپنے نام کے اوپر نشانات دیکھے۔ قلم اٹھا کر وہاں وہاں پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔ سارا کام نپٹا کر سکون کا سانس لیتے ہی دوبارہ لفافہ بند کیا۔ پھر اٹھ کر بڑی احتیاط سے کوٹ کے اسی اندرونی جیب میں ٹھونسے ہی اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔

اس دوران باہر دروازے کے پاس آکر بہو دستک دیتی ہوئی بولی۔

''پاپا۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کہو تو ادھر ہی یہاں لے آؤں''...... وہ طنزیہ لہجہ میں پوچھ بیٹھی

''نہیں بیٹی! تکلیف نہ کرنا۔ جب بھوک لگے گی تو چلا آجاؤں گا۔''

بہو واپس مڑ گئی۔ قدموں کی آوازیں دیر تک سنائی دینے لگیں۔

اُس کے جاتے ہی نجانے وہ کن بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا۔ آہستہ آہستہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

''ہاجرہ! کاش! آج تم زندہ ہوتی تو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اعتبار کرتی۔ میرے بس میں جو کچھ بھی تھا۔ میں نے اس سے پورا کر کے اپنا وعدہ نبھایا۔''

کچھ دیر کے لئے وہ اپنا سارا دکھ وکرب سمیٹتا ہوا پھوٹ پھوٹ کر رُونا چاہتا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی بہو بیٹے کے کانوں میں اس کی غیر مانوس آواز گونجنے لگتی اور اس سے پہلے دونوں دوڑے دوڑے چلے آتے۔ وہ آنکھوں پر لرزتے آنسوؤں کے زہر کو امرت سمجھ کر پی گیا اور دل مسوس کر رہ گیا۔

اُسے یاد آیا......

جب اُس نے پہلی بار ہاجرہ کو دیکھا۔ اُسے لگا جیسے وہ موندتی ہوئی آنکھوں سے کوئی جیتا جاگتا خواب دیکھ رہا ہو واقعی آج اس کا خواب سچ اور عین الحقیقت تھا۔ جو خواب عالم شباب کی راتوں میں دیکھا کیا کرتا یا رومانی اور عشقیہ قصے، کہانیوں اور انسانوں میں پڑھا کرتا۔ اس کے سامنے ہاجرہ ایسی ہی سفید موتیوں سے جڑے سرخ لہنگے میں ملفوف ایک گھڑی جیسی تشنہ لب وجام اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے وہ آسمان سے اتری پری ہو۔ جس کی بڑی بڑی خوبصورت کاجل بھری بادامی آنکھیں۔ گھنی گھنی پلکیں۔ سروقد۔ گندمی رنگ۔ نیم گلابی ہونٹ اور رخسار ریشم جیسے سنہرے گیسو بالکل گلاب کے پھول جیسی لگتی تھی۔ جو بھی کوئی اُسے پہلی بار دیکھ لیتا تو وہ اپنے ہوش وحواس کھو کر دم بخود ہو کر رہ جاتا۔

وہ اس کی جانب بڑھا اور پھر بڑھتا ہی چلا گیا۔ طمانیت کے احساس سے دونوں کے جسم وروح سرشار ہوتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیس سال بیت گئے۔ ان کی گاڑی ہنستی مسکراتی گاتی اطمینان کی رفتار سے گذر رہی تھی۔ اس دوران ہاجرہ کی گود ہری ہوگئی اور وہ ایک تندرست اور خوبصورت بیٹے کی ماں بن گئی۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا......

بیٹا بھی جوان ہونے لگا۔ چونکہ ماں باپ اپنے اکلوتے بچے کی اچھی پرورش اور تعلیم وتربیت پر کمربستہ ہوئے۔ بیٹے نے بھی انٹرویو میں حصہ لے کر اپنے شامل مدمقابل اُمیدواروں کو چاروں شانے چت کر دیا۔ نوکری لگ گئی تو آس پاس اور دور دراز علاقوں سے اس کے لیئے رشتے آنے لگے۔ کہتے ہیں نا۔ جب خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے

یا پھر اگر مقدر مہربان ہو تو پیتل بھی سونا ہو جاتا ہے۔

گھر میں بہو آ گئی۔ وہ بھی ایک اچھی خاصی کمانے والی۔ ابھی پورا ایک سال بھی نہ ہوا، اس نے ایک پیاری بچی کی خوشخبری سنائی۔ احسان علی کو دادا کا ایک نیا نام ملا جبکہ ہاجرہ دادی کے نام سے سرفراز ہوئی۔ گھر میں بچی کی کلکاریاں ہر دم خوشیوں کے راگ الاپتے سنائی دینے لگے۔ ہر کوئی خوش اور مطمعین دکھائی دیتا تھا۔

انہیں یہ دیکھ کر نہ جانے کیوں اپنے پرائے کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے اور ان کی خوشی آنکھوں میں کھٹک گئی...... اکثر صبح و شام اٹھتے بیٹھتے ان کے خلاف اناپ شناپ بکے جا رہے تھے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ انہیں احسان علی کے گھر کی شرافت اور لیاقت ان کی چھاتی پر مونگ دلتی رہتی تھی اور ان کی بددعاؤں کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔

سردی کا موسم تھا......! اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔ اچانک ایک دن ہاجرہ کو لقوہ ہو گیا...... احسان علی کی کمر ٹوٹ گئی۔ جانے اس گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔ اچھی خاصی گھر گرہستی تہس نہس ہو گئی۔ یوں سمجھو کہ خوشحال گھر کو گہن لگ گیا۔

گھر میں ہاجرہ کی تیمارداری کے لئے بہو کے پاس وقت نہ تھا۔ بار بار چھٹیوں پر جانے سے اس کے آفیسر نالاں تھے۔ بات کہ بیٹے کی ڈیوٹی کسی دُور دراز علاقے میں تھی۔ جہاں وہ ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز تھا جس کے سبب آن ڈیوٹی رہنا پڑتا تھا۔

بھلا ہو، رقیہ بیگم کا جو ہاجرہ کی علالت سن کر دوڑی دوڑی چلی آئی۔ دراصل وہ اس کی بچپن کی سہیلی اور ہم عمر تھی۔ مانا کہ ان کی آپس مین کوئی قرابت داری بھی نہ تھی۔ مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ دونوں آپس میں دو بہنوں کی طرح ایک دوسرے کا خیال رکھا کرتی تھیں ان کے درمیان خوب بنتی تھی......

آج جب حالات نارمل تھے تو وہاں اس کے پاس آ کر اپنے دکھڑے سنایا کرتی تھی۔

اب مجبوراً اُسے وہاں ہر رُوز صبح سے شام تک اس کی تیمارداری کرنے کے لئے آنا شروع ہوا اور وہ ایک ہی ٹانگ پر کھڑی ہو کر ایک اچھی نرس کی طرح خوش اسلوبی سے

کام انجام دیتی رہی۔

بچاری۔!......اُس کی بھی اپنی ایک عجیب سی کہانی تھی۔ابھی جوان ہی تھی اور شادی کے کچھ سال ہی ہوئے تھے کہ اس کا شوہر کسی ناگہانی حادثے میں ہلاک ہو گیا اُس کے ایک بیٹے کو پالا پوسا اور جوان کیا۔گھر میں کمانے والا نہ تھا۔آس پڑوس کے ہمسائیوں کے مکانوں میں جھاڑو وصفائی کر کے اس نے دوسری شادی نہ رچانے کا قصد کر رکھا تھا۔ بیٹا جوان ہو گیا اور روزگار کی تلاش میں بیرونی ملک چلا گیا۔پہلے پہل ایک عرصہ تک اس کے نام پر منی آڈر آتے رہے۔بعدازاں نفسانفسی کے عالم میں یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

وہ رات احسان علی کے لئے قیامت کی رات ثابت ہوئی جب ہاجرہ ساری رات تڑپ تڑپ کر رقیہ بیگم کی گود میں دم توڑ بیٹھی۔اس صدمے نے اُسے اس قدر مجروح اور غمگین کر دیا کہ وہ زندگی سے مایوس اور دل برداشتہ ہو کر بڑا دکھی اور اداس رہنے لگا۔جب بھی کوئی اس کے سامنے ہاجرہ کی بات چھیڑ دیتا تو اس کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہنے لگتے تھے۔ اس کی سرائمیگی کا عالم یہ تھا کہ دُور سے دیکھنے والا اُسے کوئی دیوانہ یا مجنون سمجھتا تھا۔

ابھی احسان علی دل میں ہاجرہ کی جدائی کا غم بھولا بھی نہ پایا تھا اور نہ ہی اس کے زخم مندمل ہو پائے تھے کہ اُسے نوکری سے سبکدوشی کا دوسرا غم کسی مصیبت کی طرح نازل ہوا۔اس کی حالت ایک خستہ آشیانہ جیسی ہوگئی جو چھوٹے چھوٹے تنکوں میں بکھیر کر رہ گیا ہو۔ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی زندگی سمٹ کر اب کسی دیو کی طرح بند بوتل میں قید کر لی گئی ہو۔اُسے دھکا لگا۔ہاجرہ کی جدائی کے بعد وہ دن بھر دفتری فائیلوں کے ورق گردانی اور شور وشرابے کے ماحول میں مصروف رہا کرتا تھا۔اب جب کہ ناؤ بیچ منجدھار میں ڈولنے لگی تھی ۔کوئی ایسا فرد نظر تو آیا جس کے پاس وہ اپنا دکھڑا سنا سکے۔پر کسی نے اس کے زخموں کا مداوا نہ کیا اور نہ ہی اس کا جی ہلکان کرنے کی کوشش کی۔

بلآخر تمام راستے مسدود پا کر اُسے رقیہ بیگم کے رُوپ میں مسیحا دکھائی دی اور پھر رقیہ بیگم کی خیر خبر لینے والا کوئی نہ تھا۔احسان علی لوگوں کی نظروں سے بچا بچا کر اس کے ہاں

آنے جانے لگا۔

یہ دیکھ کر احسان علی کے پاس پڑوس اور قرابت داروں کے دل و دماغ میں شک کے کیڑے کلبلانے لگے۔ انہوں نے طرح طرح کے سوال اٹھائے اور پیٹھ پیچھے چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ جب کہ اس سے پہلے ہاجرہ کی موجودگی میں کسی نے بھی دانستہ یا نادانستہ اس کی طرف انگلی تک نہ اٹھائی تھی۔

محلے میں ان کی ملاقاتوں کی خبر کسی آوارہ کیتا کی طرح ایک کے بعد دوسرے مکان تک جیسے سونگھتی ہوئی آ پہنچتی تھی۔ کہ کسی خرد دماغ نے گھر میں چنگاری بھڑکانے میں دیر نہ کی اشاروں اور کنایوں میں طعنے وگالیاں دینے کا عمل شروع ہوا۔

بہو بیٹے نے بھی کافی سمجھانے کی کوشش کی مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ترکش سے تیر نکل چکا ہے تو سختی سے کام لیتے اُسے زندگی میں مزید جینا دوبھر کر دیا۔ لیکن اس کا اثر احسان علی پر کچھ یوں ہوا۔ الٹا اُسے نے ان کا کہا ماننے سے انکار کر دیا۔ چونکہ اُسے اپنا غم اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا اور اُس دن احسان علی اپنی پوتی کو ساتھ لیکر کوئی نیا بہانہ بنا کر رقیہ بیگم کے پاس گیا تھا کہ کسی طرح سے بہو کے کانوں میں اس کی خبر لگ گئی یا شک کے بچھو نے اُسے ڈنک مارا ہو۔ پھر جب رات کو اس نے بستر پر شوہر کی باہوں میں باہیں حائل کرتے ہوئے اس کے کانوں میں سسر کے خلاف زہر گھول دیا کہ احسان علی کے باہر جانے پر روک لگنی چاہیئے۔

ابھی اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہ ہوا جب ایک دن احسان علی اپنے کمرے میں گہری نیند میں سو رہا تھا تو اس کی پوتی اس کے کمرے میں گڈا گڈی کی کہانی سننے کے شوق میں داخل ہوئی۔ دادا کو جگایا۔ مگر دادا برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔ آنکھیں کھول نہ پایا۔ منی چلائی اور چلاتی رہی۔ پھر دوڑی دوڑی ماں کے پاس آئی۔

''دادا! بات کیوں نہیں کرتے ؟'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''تم نے اسے جگایا نہیں''؟...... بہو کے آواز میں لرزش سی پیدا ہوگئی اور پھر کسی سوچ میں ڈوب کر ہچکیاں لیتی رہی۔

''میں نے جگایا تھا اور اس کا پیر بھی دبایا۔ لیکن وہ کافی ٹھنڈا اور آج اپنا پاؤں بھی نہیں ہلا رہا تھا......'' یہ سن کر وہ اُسے کچھ کہے بغیر ہی اس کے کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔

بستی میں آناً فاناً احسان علی کے مرنے کی خبر پھیل گئی۔ جسے سن کر پاس پڑوس اور رشتے دار جمع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ جن میں خصوصاً عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔

نعش ایک بڑے ہال میں رکھی گئی۔ جس کے گرد پاس ہی بیٹھی رشتہ کی عورتیں حلقہ بنانے والوں میں بہو بھی پہلے سے ہی زار و قطار رو رہی تھیں۔

جانے کیسے رقیہ بیگم کو احسان علی کے فوت ہونے کی خبر پہنچ گئی تو وہ بھی سر پر پاؤں رکھ کر سوگ وار عورتوں میں شامل ہو گئی اور کمرے کے اس گوشے میں بیٹھ گئی۔ جہاں چند عورتیں آنسو بہانے سے زیادہ اپنی گفتگو میں محو تھیں۔ رقیہ بیگم کی آنکھیں آنسو بہنے سے اس قدر سرخ ہو گئیں تھیں جیسے کسی تیل کے کنویں میں آگ بھڑک اٹھی ہو۔ اُسے دیکھتے ہی اغل بغل میں بیٹھی عورتوں کو جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی جگہ سے کھسکنے لگیں اور باہر چلی گئیں ان کے جاتے ہی رقیہ بیگم وہاں اکیلی رہ گئی۔ یہ دیکھ کر بہو پچھاڑیں کھا کھا کے رونے لگی۔ پر محلے کی دیگر عورتیں اس کی طرف ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے اُسے گاجر و مولی کی طرح چبا ڈالنے پر تلی ہو۔

دوسرے کمرے میں مردوں کی ایک بڑی تعداد کفن و دفن کے انتظامات میں لگی تھی۔ کوئی احسان علی کے بیٹے کے سامنے مگر مچھ کے آنسو بہائے دلاسہ دے رہا تھا اور کوئی قرآن کی آیتوں سے ''موت اٹل ہے'' کا ذکر کر رہا تھا۔

لاش کو نہلانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ اس دوران کہیں سے وکیل نمودار ہوئے۔

لوگوں کی ایک اچھی خاصی بھیڑ دیکھ کر اس نے اپنی جیب میں سے کاغذ کا پلندہ نکال کر اونچی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

''قبل اس کے مرحوم احسان علی کی تجہیز و تکفین کی بات کی جائے، میں ان کی لکھی ہوئی وصیت تمام لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ تاکہ میں اپنا فرض اور عدالتی کاروائی پورا کرسکوں اور احسان علی کی آخری خواہش بھی''۔ پھر وکیل نے پڑھنا شروع کیا۔

''میں احسان علی اپنے ہوش وحواس کے ساتھ یہ تحریر کرتا ہوں کہ میری نقد جمع پونجی جو لگ بھگ پانچ لاکھ روپے کے قریب بنک میں جمع ہے۔ میں نے اُسے دو مساوی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ میری پوتی اور دوسرا حصہ رقیہ بیگم کے نام کرتا ہوں کیونکہ مجھے اس کی بے بسی و غریبی اور اس کے احسان کا پورا احساس ہے۔ خدا کو حاضر و ناظر رکھ کر میں نے اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے رقیہ بیگم کو اپنی بہن تسلیم کیا تھا۔ مرحوم ہاجرہ بیگم کی حیات اور وفات کے بعد بھی ہمارا یہ رشتہ قائم رہا''۔

وکیل کے انکشاف کرنے پر لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ نہایت شرمسار ہو کر وہ اپنی بغلیں جھانکتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف نظریں ملانے کی ہمت نہ کر سکے۔ جنہوں نے احسان علی کے خلاف بہتان تراشی سے کام لیتے ہوئے بستی میں بدنام کیا تھا۔ اس طرح ان کے اندر چھپا چور اب بے موت مارا گیا۔

اور پھر اس بات کی بھنک عورتوں کے کانوں میں پڑی تو وہ سبھی ہونقوں کی طرح رقیہ بیگم کی طرف دیکھتی رہ گئیں جبکہ حقیقت حال سے بے خبر رقیہ بیگم، اپنے محسن احسان علی کے غم میں نڈھال ہوئے جارہی تھیں......!!!

............☆☆☆............

غم نے اتنا مارا

وہ اتوار کی گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔

آصف علی اپنی ضعیف اور کمزور ماں کی بینائی کا علاج کرانے کے لیے جس ڈاکٹر کے پاس گیا تھا وہ شہر کا مشہور اور ماہر آنکھوں کا ڈاکٹر تھا۔ صبح وشام کے اوقات میں گھر پر اپنا کلینک چلاتا تھا۔ اس کی کلینک پر ہمیشہ آس پاس اور دور دراز علاقوں سے مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہی کوئی دو بجے ہوں گے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ کلینک پر پہنچا۔ آصف علی نے پہلے ہال کے اندر جھانک کر دیکھا۔ ہال میں لوگوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ سبھی بنچوں پر بیٹھے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے اپنا نام کاؤنٹر پر بیٹھے شخص سے لکھوا دیا۔

اندر آ کر ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھا۔ سامنے دروازے کے پاس ایک گوشے میں بینچ پر دو خالی نشستیں تھیں۔ جہاں ایک موٹی سی بنجارن اپنی گود میں پوٹلی جیسی دبائے بیٹھی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ کسی قدر مطمئن سا ہو گیا۔ پھر وہ دونوں لپک کر اس کی بغل میں بیٹھ گئے۔

ہال ایک سینما گھر کی گیلری سے کم دکھائی نہ دیتا تھا۔ دیواروں پر طرح طرح کی عینک لگائی عورتوں کی تصاویر ٹانگی گئی تھیں۔ وہ لوگوں کے چہروں کو ایک ایک کر کے بغور دیکھتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھیڑ والی جماعت میں کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ کچھ لوگ اپنے چہروں پر سنجیدگی لیے بالکل چپ چاپ بیٹھے تھے جیسے کہ کسی سوچ میں غرق ہوں۔ کوئی باتوں میں اس قدر منہمک کہ وہ قریبی ساتھی سے اپنی دکھ بھری زندگی کا حال واحوال سنانے

میں محو۔ کسی کی نظریں دیوار پر ٹنگی مختلف اقسام کے عینک لگائی عورتوں کی تصاویر پر جمی تھیں اور کوئی سامنے انگریزی وارد و کے حروف تہجی پر نظریں مرکوز کئے ہوئے تھا۔ دیکھنے میں دلچسپ بات یہ کہ قطار میں سب سے آگے بیٹھے ہوئے اشخاص بار بار اپنا پہلو بدل رہے تھے جیسے ان کے جسموں پر چونٹیاں رینگ رہی ہوں اور اس اضطراب میں کہ کب ڈاکٹر انہیں اندر کمرے میں آنے کے لئے کہے......

آصف علی کو دیر تک اس طرح بیٹھے رہنا بالکل پسند نہ تھا۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہ تھا۔ جلد ہی اکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ وہ اپنے بوجھل پن سے نجات پانے کے لیے شیشوں کے پار دیکھنے لگا۔ اچانک اس نے ایسا منظر دیکھا کہ جسے دیکھتے ہی اس کا موڈ اچھا ہو گیا۔ باہر سفیدے کے درخت کی ٹہنی پر چڑا اور چڑیا ایک دوسرے کو نہارتے ہوئے لطف اٹھا رہے تھے۔

اچانک اس وقت اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا جب وہ کسی کی آہٹ پا کر چونک سا پڑا۔ اس کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے بھر پور گداز بدن کی ایک خوبصورت اور الہڑ دوشیزہ کو لچکتی مہکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ ہلکے رنگوں کے ملبوسات میں تتلی جیسی لگ رہی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ عینک چہرے کی خوبصورتی پر خوب سج رہی تھی کہ ہوش مند آدمی کے اوسان خطا ہونے میں دیر نہ لگتی۔

یہ دیکھ کر آصف علی تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھول گیا۔ اس کے دل و دماغ اور روح پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔

ابھی قیامت کی سی پیکر والی لڑکی دو تین قدم آگے نہ بڑھی تھی کہ اچانک نوک دار سینڈل پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ کسی کچی ٹہنی کی طرح نیچے آگری ہوتی اگر حسن اتفاق سے آصف علی نے عین موقع پر اپنے دونوں بازوؤں سے اس کا بدن گرفت میں نہ لے لیا ہوتا۔ اسی دوران لڑکی کی عینک چہرے سے اتر کر بینچ کے نیچے آ گئی تھی۔ پاس بیٹھی ایک ادھیڑ عورت نے لڑکی کی حالت دیکھی، بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر گئی ورنہ وہ کھل کھلا کر ہنسنا

دینا چاہتی تھی۔ پھر جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہیں تو وہ خفیف سی ہوگئی اور اپنا پینترہ بدل کر آمنہ بی سے ہمدردانہ لہجہ میں بولی

''دیکھا بہن! نوک دار سینڈل پہننے کا انجام......شکر ہے اس لڑکے نے اٹھ کر تھام نہ لیا ہوتا تو......تو......''

''ہاں۔ ہاں! جان بوجھ کر اس نے ایسا تو نہیں کیا ہے۔ غلطی سے اس کا پیر پھسل گیا۔''

آمنہ بی نے فوراً اس کی بات کاٹ کر اس عورت کی ذہنی کیفیت بھانپتے ہوئے کہا۔ عورت کے پہلو میں بیٹھے ہوئے کسی ساتھی مرد نے اس کی کمر میں اپنی کہنی سے ٹھوکا لگایا اور بولا......

''اب چپ بھی ہو جا۔ چکنی فرش پر سلپ کر گئی کوئی گناہ تو نہیں کیا ہے۔''

مرد نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے عورت کو ڈانٹ پلائی شاید وہ باتونی عورت تھی اور مزید کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ آمنہ بی بیچ میں بولی......

''جانے بھی دیجئے اب بھائی صاحب! خواہ مخواہ بات کو طول دینا بھی اچھا نہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے بہن جی!'' ایک العمر شخص نے خاموش رہنے کے لیے بات کا رخ موڑتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں کہا۔ اس دوران وہ دونوں سنبھل چکے تھے اور اپنے اپنے کپڑے درست کرنے لگے جب کہ کئی لوگ دیر تک انہیں گھورتے رہے۔ لڑکی نے سنبھل کر 'سوری لفظ' سے اپنی ہلکی سی مسکراہٹ میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر نہایت متانت بھرے لہجہ میں اس سے مخاطب ہوئی۔

''پلیز! ذرا عینک ڈھونڈنے میں میری مدد کریں۔''

شہد سے رس گھولتی آواز آصف کے شریر میں اتر گئی وہ تو پہلے سے ہی گھائل تھا۔

دیکھتے ہی آصف علی کی نس نس میں لڑکی کی گرمی اور حرارت سے سینے میں ابلتا لاوا بھڑک اٹھا جیسے کسی نے بھڑکتے تندور میں مزید لکڑی ڈال دی ہو۔ وہ اندر ہی اندر موم کی طرح پگھلتا رہا۔ مگر اس نے بڑے دلیرانہ انداز میں اپنے اندر کے گھناؤنے آدمی کو پچھاڑ کر رکھ دیا اور جلد ہی وہ بے قابو ہوئے جذبات کو گھوڑ سوار کی طرح رسی کھینچ لینے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے چہرے کے تاثرات کو ظاہر ہونے نہیں دیا۔ پھر جیسے ہی دل کی دھڑکن اور سانس اعتدال پر آ گئی۔ وہ نیچے جھکا اور بینچ کے نیچے ادھر ادھر عینک کی تلاش شروع کر دی۔ اتنے میں آمنہ بی نے اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ عینک اس کی سیٹ کے نیچے نظر آئی۔ اس نے آصف علی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"بیٹے آصف! ادھر دیکھو، وہ وہاں پڑی ہے۔"

آصف علی نے جھک کر دیکھا۔ عینک چکنا چور ہو کر اس کے دونوں شیشے کرچیوں میں بدل کر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ لے دے کے اس کا خالی فریم ہاتھ میں آیا۔ اس نے خالی فریم کو لڑکی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ پھر نجانے کون سے جذبے کے تحت اس کے چہرے کو بس دیکھتا رہ گیا۔ کھویا کھویا سا کچھ سوچتا رہا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ لڑکی کی آنکھوں کے نیچے سیاہ داغ کے دو گڑھے پھیلے ہوئے اس کی خوبصورتی پر چاند کے داغ کی طرح بدنما اور داغدار لگ رہے ہیں۔ اسے اس کی آنکھوں کی بینائی پر شک ہوا اور یہ شک اس وقت یقین میں بدل گیا۔ جب سرمئی آنکھوں میں دو ستارے ٹمٹماتے ہوئے اس نے ٹٹولتے ہوئے انداز میں اپنا ہاتھ بڑھایا۔

اچانک لڑکی کی حرکات سے وہ ایسے راستے کے موڑ پر آ کھڑا ہوا جو راستہ سیدھا شرم اور ندامت کی سرحد سے جا ملتا تھا۔

اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا اور بنا بنایا شیش محل پاش پاش ہو کر زمیں بوس ہو گیا اور وہ واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

............☆☆☆............

سنگ ناتراشدہ

'سچ کا بول بالا جھوٹ کا منہ کالا' وہ طوطے کی طرح رٹ لگا رہا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے وہ سوچ رہا تھا اور سوچتا رہ گیا۔

اس نے ایسا ہوتے ہوئے آج تک نہیں دیکھا تھا۔اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال نوکیلے ناخنوں کی طرح کریدتا رہا۔کئی بار وہ لوگوں کو کہتے ہوئے سنتا رہا۔تعجب سے ان کا منہ تکتا رہا۔دل ہی دل میں ان کی بات پر مضحکہ اڑاتا رہا۔اسے اتنا یاد ہے کہ کئی دفعہ اپنے بزرگوں کے سامنے جھوٹ بول کر وہ صاف بچ گیا تھا۔اس بارے میں کچھ فیصلہ نہ کرسکا۔ آخر مایوس ہوکر اس نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔نئی کلاس میں آ گیا تھا اتفاق سے پہلی بار اس نے اردو معلم کی معرفت نصابی کتاب میں پڑھا۔اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے پڑھنا پڑھانا جتنا آسان ہے اتنا ہی وہ اس کے فہم ادراک سے بالاتر تھا اور اس کے معنی ومفہوم سے بالکل بے خبر اور ناآشنا تھا۔ابھی وہ کمسن تھا۔پڑھنے لکھنے کے معاملے میں فہم و فراست بدرجہ اتم موجود تھی ۔ اتفاق سے ایک دن ایک اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اس نے لائبریری میں اپنے اردو معلم سے اس محاورہ سے متعلق مزید دریافت کیا۔جب بات سمجھ میں آگئی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

اچانک بستی میں ان کی بات نے ایسا جادوٹونے کا سا اثر کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔دیکھتے دیکھتے ان کے ہونٹوں پر بات اڑی اڑی آتی رہی۔آنا فانا یہاں سے وہاں۔وہاں سے یہاں' ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر مشہور ہوگئی تھی۔لوگ جانتے تھے کہ

آج تک بڑے بڑے دانشوروں نے ہاتھ پاؤں مارے لیکن وہ اس معمہ کا حل نہ ڈھونڈ نکال سکے۔ان کی ساری محنت اور تک ودو رائیگاں ہوگئی۔پانی پر جیسے تیرتی برف تھی۔کوئی اس کا سراغ پا نہ سکے۔ایک معمولی لڑکے نے چٹکی میں ایسا کام کر دکھایا کہ مارے خوشی سے سبھوں کو اس کی اہمیت کی داد دینی پڑی۔اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔اس کی پذیرائی کی اور شاباشی دی۔

بات کچھ ایسی ہی تھی کہ وہ اپنی بستی کا ہیرو بن گیا تھا۔جبکہ خورشید عالم کے نام سے جانا پہچانا جانے لگا۔مگر سچائی یہ ہے کہ اس سے پہلے اپنے پرائے سب لوگ اسے ملنے سے کتراتے اور وہ کمترین نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔زمانہ کتنا بدل گیا جب جب کہیں کسی گھر محفل یا دکان میں یا سڑک کے چوراہے پر اس واقعہ کا تذکرہ ہوتا تو وہ دل تھام کے بیٹھ جاتے۔ان پر رشک کا غلبہ طاری ہو جاتا۔تھوڑے دنوں بعد اس وقت لوگ بوکھلا کر رہ گئے جب اس کے باپ نے اپنی چھوٹی دکان کی مرمت کر کے اس کی چھت پر غلام محمد بٹ نام کا لکھا ہوا بورڈ آویزاں کر دیا۔خورشید عالم کو بتایا گیا تھا برسوں سے غلام محمد بٹ سلائی کا کام کرتا تھا جو اپنا شجرہ نسب اور نام کی شناخت کھو بیٹھا تھا شاید اسی لئے لوگ گل درزی کے نام سے پکارتے تھے۔حالانکہ وہ دل ہی دل میں اس پر نالاں اور چڑ چڑا کر رہ جاتا۔کٹر مذہبی قسم کا آدمی تھا۔نام اور ذات کی تبدیلی اسلام کے اصولوں کے منافی قرار دیتا تھا۔بستی میں اس معمر ترین شخص کو واحد استاد سمجھا جاتا۔جب بھی کوئی گاہک کسی نئے ڈیزائن میں سوٹ سلوانے کی فرمائش کرتا تو اس کی لاجواب کاریگری دیکھ کر انہیں دور دور سے دکان پر کھینچ لاتی۔

غلام محمد غربت اور افلاس کی چھتر چھایہ میں گزارا کر رہا تھا۔ان پڑھ اور گنوار تھا لیکن اس نے زمانے سے بہت کچھ سیکھا تھا۔

ہمیشہ خورشید عالم کو سمجھاتا رہا کہ بچپن میں وہ بزرگوں سے تعلیم کے فوائد شیخ سعدی کی داستانیں سنا کرتے۔اس کا جی للچاتا گھر سے سکول۔سکول سے گھر اور سعدی کی کتابیں مثلاً گلستان بوستان پڑھنے کے خیال میں لگا رہتا۔اچانک باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور

دوسرے دن وہ رجب درزی کی دکان پر آگیا۔اس کی معصوم ابھرتی خواہش دل میں ہی دب کر رہ گئی اور وہ اپنے بڑوں کے سامنے اس کا اظہار بھی نہ کرسکا۔ ہر صبح جب وہ بستی کے بچوں کو سجے دھجے رنگین الگ الگ یونیفارم میں ملبوس کاندھوں پر بیگ لٹکائے ہاتھوں میں تختیاں اور گیلی مٹی کی چھوٹی چھوٹی سی بوتلیاں لئے سرکاری سکول جاتے دیکھتا تو اسے خوابوں کا محل ٹوٹتا نظر آتا۔اس کے ننھے سے سینے میں گھٹن سی محسوس ہوتی۔زندگی میں کوئی خلاء یا کسی چیز کی محرومی کا تلخ احساس اور بھی شدید ہو جاتا۔اس کے اعصاب پر مسلط ہو کر بری طرح جھنجھوڑتا ہوا وہ سوچنے لگتا۔کاش! میں بھی ان لڑکوں کے ساتھ سکول جاتا۔وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔دیکھتے ہی دیکھتے ایک زمانہ گزر گیا۔اس کے ہاں ایک خوبصورت ننھا منا بیٹا پیدا ہوا۔بچپن سے بیٹے میں شوق اور لگن دیکھتے ہی اس کی زندگی شوخ انگڑائی لیتی رہتی۔ جیسے ابلتا خون دوڑنے کی آنچ اس کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی۔اسکے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ ٹھاٹھیں جوش مارنے لگتا۔

خورشید عالم اس کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔اسے از حد پیار کرتا۔بستی کے ایک سرکاری سکول میں پڑھ رہا تھا۔شاید اب وہ خورشید عالم کو پڑھنے پڑھانے سے اپنے ادھورے خواب کی تعبیر پانے کی سعی کر رہا تھا۔

خورشید عالم آٹھویں جماعت میں داخل ہوا۔ جماعت کے لڑکوں میں وہ سب سے پڑھائی میں بہت زیادہ ہوشیار اور سمجھدار تھا۔ ہر جماعت میں وہ ہمیشہ ہی اول درجہ حاصل کرتا رہا۔

خورشید عالم نے اپنے کئی دوست بنائے۔باقر علی اور سلیم مرزا سے بہت یارانہ بنا رکھا تھا۔ چونکہ بچپن سے وہ تینوں ایک ہی جماعت میں اکٹھے پڑھتے آرہے تھے۔ایک دوسرے کے قریب قریب اٹھتے بیٹھتے اور ایک دوسرے کے معاملات میں دلچسپی لیتے رہتے۔علاوہ ازیں سکول کے مختلف تمدنی اور تعلیمی پروگراموں کے روح رواں سمجھے جاتے۔ اس بنا پر سارا سکول انہیں گاندھی جی کے تین بندر یا تکونی کے نام سے پکارتا۔وہ ہر ایک

چھوٹے بڑے میں مقبول ومعروف تھے۔ بہت سی باتیں ان میں یکساں پائی جاتی تھیں۔ البتہ ان کے مزاجوں اور عادات واطوار میں بڑا فرق تھا۔ خورشید عالم ان سے الگ خاموش طبیعت کا مالک تھا۔ شرم وحیا اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جھوٹ بولنے اور بیڑی وسگریٹ پینے کی بری عادت کے معاملے میں وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں تمبا کونوشی سے دق کی شکار ہوئی ہے۔ سارا دن کھانستی رہتی ہے۔ کئی بار خون بھرا تھوک اگل دیتی۔ اس کا بچنا محال دکھائی دیتا۔ اتفاق سے ایک روز جمعتہ المبارک کی نماز کے دوران جامع مسجد کے امام صاحب خطبہ دے رہے تھے۔ جسے سن کر وہاں سب سامعین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔کئی شریف النفس اور حساس لوگ آگ بگولہ ہو گئے اور لاحول پڑھنے لگے۔ کئی چپ چاپ نظریں نیچی کر کے زانوں میں اپنے سر چھپائے تھے جیسے وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں ۔کسی نے سنی ان سنی کر دی۔ اور اسے بے تکی بات سمجھ لیا ہو۔ کچھ ان میں اپنا پیدائشی حق خیال کرتے رہے۔ پھر بھی وہ آنکھوں میں تجسس لئے حقیقت حال جاننے کے لئے بے چین تھے۔

سنا ہے کئی ہفتوں سے بستی کے اندر اور باہر آس پاس کے علاقوں میں ایک نا معلوم مافیا گروپ سرگرم عمل ہو گیا ہے۔ جو گانجا، چرس، براؤن شوگر اور افیون کا کاروبار چلا رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور نو جوانوں کو بہلا پھسلا کر اپنا شکار بناتا ہے۔ ایسے بدقماش اور لفنگے لوگ زیادہ تر بازاروں سکولوں اور شفا خانوں کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ اب تک پولیس ان غنڈوں اور اوباش لوگوں کو پکڑنے میں ناکام رہی۔ یہ بستی چونکہ گنے چنے شریفوں میں شمار کی جاتی ہے اب شریف بہو بیٹیوں کے لئے گھروں سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ لفنگے لچے آوارہ سرراہ بازار کھلے بندوں چھیڑ خانی سیٹیاں اور فقرے کستے نظر آتے ہیں۔ اس نے تنبیہ کر کے اخلاق سوز سماجی بدعات کا قلع قمع اور تدارک کرنے پر زور دے دیا۔ خورشید عالم پوری طرح سنجیدہ تھا۔ اس کی ہر بات کو غور سے سنتا رہا۔

خوشی خوشی زندگی گزر رہی تھی۔ پڑھائی بھی خوب ہو رہی تھی۔ لنچ کے وقت سکول کا

گیٹ کھلا رہتا۔اور وہ تینوں دوست دوسرے لڑکوں اور اساتذہ کے ساتھ باہر نکلتے۔ باہر سڑک پر آکر خورشید عالم مقامی مسجد شریف کا رخ کرتا تھا۔ وہاں اکثر اوقات اس کا باپ امامت کے فرائض انجام دیتا تھا۔اس کے دونوں ساتھی باقر علی اور سلیم مرزا دوسرے لڑکوں کے ہمراہ پاس ہی کے ایک کھلے میدان میں اپنا زیادہ وقت گزارتے۔ دور دور تک پھیلے ہوئے درختوں کے جھنڈ اور گھنی جھاڑیوں کے اندر چوری چھپے سگریٹ پھونکتے۔ گپیں مارتے۔موج مستی مناتے تھے۔

پچھلے کئی دنوں سے خورشید عالم گیٹ کے سامنے کھڑے ایک اوباش قسم کے نوجوان کو درخت سے ٹیک کر انتظار کرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ خستہ حال میلی کچیلی شرٹ اور جینز پتلون میں پیشانی پر لمبے لمبے گھنگریالے بکھرے بال۔سرخ انگارہ جیسی آنکھیں اور چہرے پر زعفرانی رنگت۔ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مردہ قبر پھاڑ کر باہر نکل آیا ہو۔ جب وہ انہیں دیکھتا تھا تو آواز دے کر بلاتا تھا۔وہ ہمیشہ اپنے ہونٹوں میں ادھ جلا سگریٹ دبائے رکھتا تھا۔ گرمجوشی سے ملا کرتے پھر وہ تینوں دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ کئی دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آگئے۔نجانے ایسی کون سی بات بڑی دیر تک ان کے درمیان گفت وشنید ہوتی رہتی تھی۔ اگر چہ خورشید عالم نے حقیقت کو دریافت کرنے کی بہت کوشش کی مگر ہر بار وہ بغلیں جھانکتے ہوئے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ٹالتے رہتے۔ جو دیر تک معمہ بنی اس کے ذہن و دل میں کھٹکتی رہی۔

جب چھٹی ہوتی معمول کے مطابق سکول کا گیٹ دوبارہ کھلتا۔ سارے لڑکے سیلاب کے ریلوں کی طرح بے سمت نکل پڑتے۔ جیسے کسی دریا کا باندھ ٹوٹ گیا ہو۔ بھوک سے نڈھال۔ وہ اپنے اپنے گھروں کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے جاتے۔ جب وہ تینوں سڑک کے دوراہے پر پہنچ جاتے وہاں خورشید عالم کے دونوں ساتھی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے دوسری جانب نکل پڑتے۔ جبکہ گھر تک جانے کا ان کا ایک ہی راستہ تھا۔ دوسرا راستہ بس اڈے کو جاتا۔ خورشید عالم اکیلا ہی رہ جاتا۔ چپ چاپ اپنے گھر کی راہ پکڑ لیتا۔ گھر میں

داخل ہوتا بستہ طاق پر رکھ کر فوراً کپڑے بدل کر ہوم ورک مکمل کرنے میں منہمک ہو جاتا۔

کام سے فارغ ہو کر بستی کے باہر کھلے کشادہ میدان میں چلا جاتا۔ سورج ڈھلنے سے پہلے ہی گھر لوٹ آتا۔ وہ کرکٹ۔ فٹ بال کھیلتا۔ دن بھر اس میدان میں بچوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ دھان کے کھیتوں کا دور دور تک پھیلا ہوا سلسلہ تھا جو کہ بے حد دلکش لگ رہا تھا۔ اس سے لگ کر زمین کا ایک بڑا حصہ غیر آباد سوکھا اور بنجر پڑا تھا۔ آبپاشی کا کوئی معقول انتظام اور بندوبست نہ تھا۔ ایک بڑے حصے میں لوگ وہاں اپنی اپنی بھیڑ بکریاں اور گائیں، بھینسیں چرنے کے لئے چھوڑتے۔ بالائی حصوں پہ جہاں کہیں کہیں جھاڑیاں اور لمبی لمبی گھاس کی وافر مقدار مل جاتی۔ پیٹ بھر بھر کے کھا لیتے۔ ایک بڑے حصے کو کھیلنے کا میدان بنایا گیا تھا۔

اس سے لگ کر دوسرے بڑے حصوں کو بھیک منگوں اور بنجاروں نے اپنا قبضہ میں لے رکھا تھا۔ لمبی لمبی قطاروں میں چھیتھڑوں اور پالی تھین سے بنے خیموں میں رہ رہے تھے۔ دیکھنے میں کتنا عجیب سا لگتا۔ کہ جب کھلی جگہ میں چھوٹے چھوٹے بچے گالی گلوچ لڑائی جھگڑا اور کرکٹ کھیلتے کھیلتے لطف اٹھاتے۔ سب کے سب نیم برہنہ ننگے مٹی کی رنگت سے بھی بدتر۔ ادھیڑ آدمی باری باری حقے کی نے اور بیڑی کے کش لگاتے۔ کئی تاش کے پتوں کو لہراتے ہوئے گویا زندگی کی تمام حسرتوں کو داؤ پر لگا کر بھرپور، مزا چکھ لیتے۔ چند بوڑھی ضعیف عورتیں چولہے کو پھونک پھونک کر دق کے مریض کی طرح کھانستی رہتی تھیں۔ چہرے پر میل دھوئیں کی اتنی پرت چڑھی ہوتی جیسے برسوں سے نہ نہایا نہ دھویا ہو۔ کوئی چولی کھلی ہوئی پاؤں پسار کر دھوپ سینکنے میں محو گفتگو ہوتی۔ تو کوئی ماں ننگے سینے سے لگا کر شیر خوار بچے کو دودھ پلاتی۔

سامنے اس بوڑھے چنار کے درخت کے نیچے ایک مست کڑیل نوجوان بیٹھا کرتا تھا۔ ہمیشہ وہ فضا میں چنگاریاں بکھیرتا ہوا سارا ماحول کو پر اسرار بنا دیتا۔ کبھی کبھی دیسی

شراب کے چند گھونٹ غٹ غٹ حلق سے نیچے انڈیل لیتا۔ چٹائی پر دراز ہو کر بک بک کرنے لگتا۔ اناپ شناپ کہتا رہتا۔ بستی کے چند آوارہ گرد نوجوان اس کے پاس آتے جاتے۔ دیر تک وہاں چرس گانجا پی لیتے اور کھسر پھسر میں باتیں ہوتی رہتیں۔ خورشید عالم کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔

آج اتوار ہے موسم کا قہر صبح سویرے ہی شروع ہو گیا۔ جیسے ہی زبرون پہاڑی سے سورج غضب ناک مکھوٹا پہن کر نمودار ہوا۔ تب ہر کسی کے بدن سے پسینہ چھوٹنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا وہ نمکین پانی میں نہائے جا رہے ہوں۔ ایک عجیب قسم کا خوف ماحول پھیلا ہوا تھا۔

تھانے کے کمپاؤنڈ میں بستی کے چند معزز لوگ ٹاٹ پر بیٹھے۔ ایک دوسرے کی طرف سراسیمگی کی نظروں سے دیکھتے جا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں کھسر پھسر کی آوازیں بلند ہوتی ہوئی کسی سنگین المیہ کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ سامنے تھانیدار اپنے دو ماتحت عملہ کے ساتھ کرسیوں پر براجمان تھے۔ پہلو میں سکول کے ہیڈ ماسٹر سمیت دو اساتذہ اور مولوی صاحب اپنی جگہ پر دھنسے ہوئے کافی شرمسار اور پریشان لگ رہے تھے۔

پاس ہی کھڑے ایک لائن میں سات آٹھ لڑکے تھے ان میں خورشید عالم بھی شامل تھا۔ رہ رہ کے ان کی تجسس بھری نظریں سامنے کھڑکی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ جبکہ دروازے پر آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اندر کمرے میں تھوڑا اندھیرا تھا۔ کئی سرکتے سائے فرش پر سر جھکائے ہوئے اکھڑے اکھڑے حالات میں بیٹھے ہوئے تھے اور کارروائی شروع ہوئی تھی۔

تھانیدار اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے اپنی انگلیوں سے موٹی بھدی مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا۔ اس کی گرجدار آواز سارے ماحول پر جیسے تازیانہ برساتی رہی۔ ساتھ ساتھ دبا دبا قہقہہ سنائی دیا۔ اس کی مسکراہٹ پراسرار تھی۔ وہ کہے جا رہا تھا۔ جس نے لوگوں کے حواس گم کر دیئے اور وہ اپنے سر چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ پولیس کو اس کامیاب مشن میں مافیا گروہ کے

دو بڑے سرغنوں کا پتہ لگ گیا ساتھ ہی ان چند نوجوانوں کو پکڑنے سے اس بات کا سراغ مل گیا جو اس بستی میں گانجا چرس اور براؤن شوگر کا ناجائز کاروبار چلا رہے تھے۔ اس گروہ کا سرغنہ دراصل بنجاروں کی بستی کا وہ مست کڑیل جوان تھا اور اس کا دوسرا ساتھی نیلی نیلی آنکھوں والا بھی اس وقت ہماری زیر حراست میں ہے۔

مزید جانکاری دیتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا کہ ان سماج دشمن عناصروں میں بستی کے چند نوجوانوں کے خلاف شہادت دی آگئی ہے لہٰذا۔

محکمہ پولیس کی جانب سے وہ ایسے نوجوانوں کو سلام پیش کرتی ہے جو قوم کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے کسی ذات۔ مذہب، رشتہ یا دوستی کو ترجیح نہیں دیتے ہیں اور اپنے اچھے کاموں سے ملک قوم کا نام روشن کرتے ہیں۔

حکومت کی جانب سے خورشید عالم کو نقدی دس ہزار کے علاوہ ایک توصیفی سرٹیفکیٹ عطا کیا گیا ہے۔ دیگران کو فی کس دو دو ہزار......

یہ سنتے ہی تھانے کی دیوار میں لکڑی کے خستہ دروازے سے پشت لگائے غلام محمد کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے شروع ہو گئے۔ وہ پھولے نہیں سمایا۔ بیٹے کی سچائی کے بل پر اس کی بے مثال قربانی دیکھتے ہوئے اس کے بدن میں ایک نئی طاقت آ گئی تھی۔

خورشید عالم ہاتھوں میں چیک اور توصیفی سرٹیفکیٹ لئے پتھر کی مورت بنا دیکھتا جا رہا تھا۔ جبکہ اس کے دونوں دوست سلاخوں کے پیچھے اپنی غلطیوں پر نادم اور شرمسار ہو کر پچھتا رہے تھے اور اب کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہ گئے تھے۔

ادھر تھانے کی چھت پر کوئی بھولی بھالی فاختہ اُن کی دوستی پر سوگ منانے میں مشغول تھی۔

............☆☆☆............

چُمی

آ...... آ جا......! چنو بیٹے۔ آ گلے لگ جا۔ کتنے دنوں سے آنکھیں دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ کلیجہ پھٹنے کو آیا تھا......''

کریم بخش نے چنو کا نازک گال چُوما تو وہ بے اختیار رُونے لگا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اُس نے نفیسہ سے پوچھا۔

''توبہ! توبہ نفیسہ! کیا ہو گیا ہے اسے؟ کہیں یہ مجھے بھُولا تو نہیں؟ ہاتھ لگانے بھی نہیں دیتا آسمان سر پر اٹھا لیا......''

''نہیں کاکا......! دراصل بہت دنوں بعد دیکھا ہے نا اور پھر تمہاری لمبی نوکیلی داڑھی مُونچھیں چھبتی بھی ہوں گی ورنہ تمہارے ساتھ تو ہمیشہ ہنستا مسکراتا کھیلتا رہتا ہے۔''

چنو کا جھٹپٹانا دیکھ کر ماں ممتا کے مارے بے چین ہو گئی۔ آخر ماں جو ٹھہریں۔ وہ اس کی آنکھوں کے جھلملاتے آنسو برداشت نہ کر سکی اور ہاتھ بڑھا کر بڑے پیار سے اسکا سر سہلانے لگی۔ پھر ہونٹوں پر بناوٹی مسکراہٹ لاتی ہوئی اپنی بات آگے بڑھائی۔

''بہت دنوں تک تم سے دُور رہنا بھی ایک وجہ ہے۔ میں اُسے لے کر اپنے میکے جو گئی تھی۔''

''اچھا...... اچھا...... یہی بات ہو گی۔ ورنہ کیا ڈرتا......'' کریم بخش مسکرا کر بولا اور خاموش ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد پھر جونہی وہ کسی سوچ سے باہر آیا تو اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مایوسانہ لہجہ میں بولا۔

''آجکل تو بڑے دل گردہ والے بھی لمبی داڑھی اور مونچھ والوں سے خوف کھاتے ہیں۔ کبھی اُنہیں دہشت گرد۔ کبھی ملٹنٹ اور کہیں اگر وادی کے نام دیتے ہیں۔ اس ننھے بے چارے کی اوقات ہی کیا۔ ابھی تو یہ دودھ پیتا بچہ ہے۔''

یہ کہہ کر کریم بخش نے معصوم چنّو کو نفیسہ کی گود میں ڈال دیا۔

''بڑا شرارتی ہوگیا ہے۔'' نفیسہ جھنجھناہٹ کے عالم میں بولی۔ اس ڈر سے کہ مُبادا کریم بخش بُرا نہ مان لے۔ اس کی بے بسی دیکھنے کے لائق تھی۔

چنّو بڑا پیارا بچہ تھا۔ یہی کوئی ڈیڑھ سال کی عمر کا ہوگا۔ گول مٹول سا چہرہ۔ ننھا سا فربہ جسم بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ جو بھی کوئی اُسے دیکھتا، بس دیکھتا رہ جاتا......

کریم بخش کا دل بھی کسی عاشق مزاج دادا سے کم نہ تھا وہ اُسے دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا۔ جب اُسے دیکھتا ہمہ وقت اپنے سینے سے لگا کر چما ضرور لے لیتا اور کچھ نہ کچھ ننھی سی انگلیوں میں تھمائے بغیر نہ جانے دیتا۔ کبھی بسکٹ۔ کبھی مٹھائی۔ کبھی کھلونے...... یہ تو اس کا معمول تھا۔

نفیسہ پاس پڑوس میں رہنے والے معمولی گھرانے کی بہو تھی۔ اس کے اندر وہ تمام رعنائیاں موجود تھیں جو ایک اچھی سلیقہ مند اور خدمت گزار بہو میں ہونا چاہئے تھی۔ بولنے لگتی تو جیسے کانوں میں شہد گھولتی میٹھی زبان سے سارا ماحول جگمگا دیتی۔ ہر دل جھومنے لگتا۔ حسد، کینہ اور طعنہ بازی اس کے مزاج کو چھو کر بھی نہ گئے تھے......گھر میں بوڑھی ساس تھی جو ایک عرصہ سے بستر علالت پر دراز پڑی یوں سمجھو موت وحیات سے جنگ لڑ رہی تھی۔

سورج کے آسمان سے جھانکتے ہی نفیسہ کا مرد کام پر نکل جاتا تو وہ گھر میں تنہا سی پھر دن بھر کام میں جنون کی حد تک جٹی رہتی کہ رات بستر پر وہ تھکی ماندی اور نڈھال پڑ جاتی۔ اُس نے اپنی شرافت اور لیاقت سے کریم بخش کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ وہ بھی اُسے بیٹی کی طرح سمجھ رہا تھا۔

نفیسہ دن میں کئی بار بازار کا چکر کاٹتی۔ بازار قریب ہی تھا۔ بار بار جانا مشکل

بھی نہ تھا۔ آج وہ بہت دنوں کے بعد میکے سے آئی تھی اور اب جب چنّو کو گود میں لے کر بازار گئی طرف نکلی تو کریم بخش کو دیکھا۔ کریم بخش نے پاس آنے کا اشارہ کیا تھا۔

پاس گئی تو کریم بخش نے چنّو کے لئے اپنے دونوں بازو بڑھا دیئے۔ اُسے دیکھ کر پہلے چنّو گھبرا گیا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے اماں کے سینے سے لپیٹ کر اپنا منہ چھپانے لگا۔ پھر جیسے ہی نفیسہ نے سینے سے الگ کر کے اسے اس کی بانہوں میں ڈال دیا تو کریم بخش نے جھپٹ کر بوسہ لینا چاہا۔ چنّو نے پیچ و تاب کھانے کے انداز میں اپنے بسورتے چہرے کا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور اس کی مضبوط گرفت سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی......

وہ دوبارہ اماں کے سینے کی طرف لپکا۔ اماں کی گود میں آتے ہی حواس باختہ ہو کر رُونے چلانے لگا۔ کریم بخش کو خشمناک نظروں سے ٹکر ٹکریوں دیکھنے لگا جیسے اس کے چہرے پر کی داڑھی موچھوں سمیت نوچنا چاہتا ہو۔ مگر یہ سب اس ننھے کے بس میں نہ تھا اور نہ ہی ایسا ہو سکتا تھا......

نفیسہ نے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر سلانے کی کوشش کی۔ کریم بخش اُسے دیکھتا رہ گیا......!

وہ اندر ہی اندر چنّو کی اس بچگانہ حرکت پر شرمسار ہو کر سوچنے لگی۔ ماں ہونے کے باوجود وہ اس معاملے میں کیا کر سکتی ہے؟ بچہ نادان ہے۔ نٹ کھٹ اور معصوم ہے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ بچے شرارتیں تو کرتے ہیں۔ کون اپنا کون پرایا۔ اُسے ایسی باتوں سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ دُودھ کا متوالا دُودھ پینے کے لئے ترس رہا تھا۔

کریم بخش بستی میں کریانہ کی دکان چلا رہا تھا۔ دن بھر اس کی دکان کے آگے اتنی بھیڑ سی لگی رہتی تھی کہ اِدھر اُدھر جانے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ باوجود اس کے دل میں بستی کی ترقی و بہبود کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ بظاہر ترش مزاج اور جھگڑالو قسم کا آدمی نظر آتا تھا مگر اصل میں منکر المزاج اور فرشتہ صفت انسان تھا۔ یعنی سینکڑوں میں ایک......اور وہ ایسا بُرا

بھی نہ تھا کہ کوئی اس کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت کرسکتا......

دو۲ سال پہلے اعظمیٰ کی بیٹی کو آپریشن کرنے کی ضرورت پڑی تھی تو اس وقت ڈاکٹروں نے خون کی دو۲ بوتلیں مانگیں تھیں۔ وہ سنتے ہی دوڑ کر فوراً اسپتال جا پہنچا تھا اور خون کی بوتل دے کر اس کی جان بچائی تھی۔

بے شک قد و قامت کے لحاظ سے وہ ذرا مختلف سا تھا۔ ہٹا کٹا بھرپور توانا جسم کا مالک کہ دُور سے دکان میں کسی سانڈ کے گھس کر بیٹھنے کا گمان ہوتا تھا۔ بارعب چہرے پر مہندی سے رنگی داڑھی اتنی لمبی اُگا رکھی تھی کہ سینے پر پھیلے ہوئے بے ترتیبی سے پھیلی کھلے چھاتا جیسی لگ رہی تھی اور روزانہ تیل لگانے سے بال نرم و ملائم شفاف ریشم تاروں کی طرح دمکتے نظر آرہے تھے۔ لباس کے معاملے میں نہایت نفاست پسند تھا۔ صاف ستھرا دھلا ہوا سیاہ رنگ کی قمیض شلوار اس کا من پسند لباس تھا...... کھڑی تلوار نما مروڑی مونچھوں نے اس کی بارعب شخصیت کو مزید خوفناک بنا دیا تھا اور ان مونچھوں پر اسے خوب ناز تھا۔ مجال تھا کہ کوئی مائی کا لعل اس کا مقابلہ کرنے کا ارادہ بھی کرتا اور کلین شیو والے جب جب اُسے دیکھتے تو خوف کے مارے اُن کی چھاتیوں پر سانپ لوٹ جاتے۔ بستی میں سب لوگ ان کو کاکا ہی کہتے تھے۔

ایک بار ایک لفنگے کو اتنا مارا کہ کئی دنوں تک خون تھوکتا رہا۔ ٹوٹی ہڈیاں اور پسلیاں جڑنے میں تین مہینے لگ گئے۔ قصور صرف یہ تھا کہ اُس سر پھیرے نے ایک راہ چلتی لڑکی پر گندہ فقرہ کسا تھا۔

ابھی نفیسہ جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ اُس نے رکنے کا اشارہ کیا۔ شاید وہ چنو کو مٹھائی یا بسکٹ دینا چاہتا تھا۔ دفعتاً ایک گاہک کچھ سامان خریدنے کے لئے دکان پر چڑھ آیا۔ اُسے دیکھ کر نفسیہ ایک جانب کھڑی ہوگئی اور اس کے جانے کا انتظار کرنے لگی تھوڑی دیر بعد جب گاہک سودا لے کر چلا گیا تو وہ آگے بڑھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوگئی۔ کریم بخش چنو کو پچکار کے بولا۔

''یہ لو چنو بیٹے۔اب کی بار تو چمی لینے دے۔''

اتنا کہہ کر کریم بخش نے اپنا منہ آگے بڑھایا ہی تھا کہ چنو نے غصے میں آ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی مونچھیں پکڑ لیں اور کھینچ کر اتنے زور کسے جھٹکے دیئے کہ درد کے مارے اُسے نانی یاد آ گئی۔دن میں تارے نظر آنے لگے اور آنکھیں آنسو سے بھیگ گئیں۔

نفیسہ چنو کا یہ جارحانہ نظارہ دیکھ کر شرمندہ ہوگئی۔وہ اُسے سخت سست کہنے لگی مگر چنو آخر بچہ تھا۔اُسے یاد آیا کہ ایک دن شیر شاہ سوری نے شکار کرتے ہوئے شیر کو تلوار سے دو حصوں میں پھاڑ ڈالا تھا، بس اس کی جیسی غیر مرئی قوت سے چنو نے بھی اپنے نرم و ملائم ہاتھوں سے شیر ببر جیسی شخصیت کی درگت بنا دی کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکا۔کچھ بھی نہیں......!

عجب اتفاق کی بات ہے ایک دن کریم بخش کو ایک سانحہ پیش آیا کہ اس کا دل اچھل کر جیسے اس کے حلق تک آ گیا۔اس کو معلوم نہ تھا کہ چھوٹی سی بات ایک بھیانک شعلے کی صورت اختیار کرلے گی اور پتہ نہیں آگے چل کر کیا گل کھلا دے گی۔

یوں ہوا کہ نفیسہ کریم بخش کی دکان کے تھڑے پر کھڑی چنو کو بہلا رہی تھی۔ جس نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر دیا تھا اور چپ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔یہ صورت حال نفیسہ کے لئے پریشان کن تھی۔ بچے کو بہلاتے سہلاتے سینے سے اس کا آنچل ڈھلک گیا تھا۔اس نے قمیض کا بٹن کھولا اور اپنی چھاتی چنو کے منہ میں کھبو دی۔شومئی بخت وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔کریم بخش سے رہا نہ گیا۔اُس نے معمول کے مطابق چنو کو ہنسے ہنسانے کے لئے ، پیٹ کا گدگدانا شروع کیا۔اتفاق سے کھیلتے کھیلتے اس کا ہاتھ چنو کے منہ سے لگی چھاتی سے مِس ہوا۔پاس ہی ایک لفنگا نوجوان جو یہ سب دیکھ رہا تھا۔اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ تیر گئی۔مارے شرمندگی سے کریم بخش کی پیشانی پر پسینے کی بے شمار بوندیں پھوٹ پڑیں اور چہرے پر بے بسی کی عجب سی لہر دوڑ گئی جب کہ نفیسہ کا ردعمل بالکل خفیف سا تھا۔

کریم بخش سمجھا کہ بات ختم ہوگئی مگر بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ابھی نفیسہ مین راستہ

میں تھی کہ اُس لفنگے نے افواہ اڑا دی کہ کریم بخش نے موقع کا فائدہ اٹھا کر نفیسہ کے ساتھ بد تمیزی کی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستی کے کچھ آنگنوں میں برسات کے بارش کے طرح بات پھیل گئی۔ ادھر نفیسہ کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ ہر ایک کے سوال کا جواب دے سکتی۔ جب کہ کریم بخش اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگا تھا۔

مانا کہ لوگوں کے دلوں میں کریم بخش کے تئیں کافی عزت و حترام اور خلوص تھا لیکن ایسی روشن خیالی بھی نہ تھی کہ معاملے کے تہہ میں اتر جاتے۔ دیکھا گیا ہے کہ اپنا الوسیدھا کرنے کے لئے لوگ عورت کو دیوی کا درجہ بھی دیتے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کی طرح اس کا آدر اور اُس کی پوجا کرتے ہیں۔ لیکن جب اپنی اوقات پر آتے ہیں تو اُسے کھلونا بنانے کا موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لیکن بستی میں ایسے بہت سے روشن خیال بندے بھی تھے جو اس افواہ پر اعتبار کرنے پر تیار نہ تھے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ ایک مضحکہ خیز مفروضہ ہے۔

کئی دن بعد وہ اُسے دیکھتا رہ گیا۔ جو اپنی نظر نیچی کئے چنو کو اپنے آنچل میں چھپائے ہوئے تیز تیز قدم اٹھائے جا رہی تھی۔

کریم بخش نے جونہی پکارنا چاہا کہ اچانک اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اس کا گلا بُری طرح خشک ہو گیا اور زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی۔ اب جب کہ اس نے اپنا ہاتھ اشارہ کرنے کے لیے اوپر اٹھایا اٹھ نہ سکا۔ مایوس ہو کر اس کا ہاتھ گلے سے پھیر کر ہونٹوں پر آیا۔ تو اُسے محسوس ہوا کہ تلوار نما مونچھیں بے پتوار ناؤ کی طرح اس کے ہونٹوں پر ہچکولے کھا رہی اپنا ساکھ کھو بیٹھی ہیں۔!

مایوس ہو کر کریم بخش نے معمول کے مطابق پیچھے دکان کی دیوار سے پشت ٹکا لیا اور اپنی فاقہ مست زندگی کو کوستا رہا جس کو وہ اپنا سب سے قیمتی اثاثہ سمجھتا تھا اس کی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں اور غصے سے کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔

نہ چاہتے ہوئے وہ غصے میں بھرے ہوئے پریشان اور شکست خوردہ باپ کی

طرح اُسے دور تک قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا اور بڑبڑاتا رہا۔

''اس بالشت بھر لونڈیا کی یہ جرأت کی آج آنکھیں اٹھا کر دیکھنا گوارہ نہیں کیا''۔

اس نے حسرت بھری ایک سرد آہ کھینچ لی اور اپنا غم دور کرنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ نفیسہ نے جیسے اس کے ہرے زخموں کو کریدا تھا اور اُسے کربناک درد سے ہمکنار کر دیا تھا۔

اچانک کریم بخش اس وقت ایک پل کے لئے ٹھٹھک گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک آٹو رکشا نفیسہ کے قریب رک گیا ہے۔ اس میں سے وہی لفنگا وُچکا نوجوان اتر کر اسکے سامنے کھڑا ہو گیا ہے۔ جس نے چند دن پہلے بستی میں کریم بخش اور نفیسہ کے مابین زہر اُگل دیا تھا۔ شاید وہ اُس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے بنا کچھ کہے خاموش اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ پھر جیسے ہی دوسرے لمحے وہ دونوں آٹو رکشا میں سوار ہوئے تو کریم بخش کی نظریں دور تک ان کا تعاقب کرنے لگیں۔ ان کے جاتے ہی وہ بس اپنی درویشی صفت مزاج کی قلندری کی لکیر پیٹتا ہی رہ گیا۔ دیر تک کوئی فیصلہ بھی لے نہ سکا۔ جس نے اُسے بُت بنا کے چھوڑا تھا۔

............☆☆☆............

کلی کی بے کلی

وہ اُس منظر کو دیکھتے ہی تلملا اٹھی جیسے کسی نے اُسکے سر پر گرم پانی کی بالٹی انڈیل دی ہو۔ یک لخت اسکے سپاٹ اور ریشم جیسے ملایم چہرے پر تحیر کے آثار پھیل گئے۔ نشیلی آنکھوں سے نفرت وحقارت کی جیسے چنگاریاں برسنے لگیں۔ کنپٹی کی رگیں تن گئیں اور کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔

بات دراصل یہ نہ تھی کہ اُس نے پہلی بار دیکھی یا سُنی ہو اور پھر برداشت نہ کر پائی ہو۔ حالانکہ ایسے واقعات روز ایک عام سی بات ہو کر رہ گئی ہیں۔ اسکے باوجود دوسروں کو کسی دکھ اور درد سے تڑپتا ہوا دیکھتی تو وہ تڑپ کر رہ جاتی۔ اُس سے رہا نہیں جاتا۔ یکا یک اسکے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی چھا جاتی اور ایک نا قابل برداشت چبھن سی اندر محسوس ہونے لگتی۔

آج اچانک اُس واقعہ کو سنکر اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کتاب زندگی کھول کر کوئی خوں گشتہ ورق یاد دلایا گیا ہو۔ دُور بیٹھا اسکا خاوند کوئی انگریزی اخبار پڑھنے میں مشغول تھا اور گذشتہ کل کے مقابلہ حسن جاتی امتحان میں لی گئی تصویروں میں اُلجھا ہوا تھا۔ سامنے اسکے اُردو کے کئی لوکل اخبار اِدھر اُدھر بے ترتیب بکھرے پڑے ہوئے تھے۔

کمرے کے ایک گوشے میں میز پر ٹی وی رکھا ہوا تھا اور اسکے کسی لوکل چینل سے ایک خوبُرو نوجوان ملک بھر کی خبریں نشر کر رہا تھا۔ وہ سکرین پر آنکھیں مرکوز کئے گم صم سی بیٹھی تھی۔

''کل شام دہلی کے ایک علاقے میں دو غنڈوں نے ایک کم سن طالبہ کا بلاتکار کیا جسے سنکر لوگ مشتعل ہو کر سڑکوں پر آ کر مظاہرے کرنے لگے اور ملوث افراد کو کڑی سے کڑی

سزا دینے کی مانگ کر رہے تھے ......حالت دگرگوں ہونے کے پیش نظر پولیس کو چوکسی بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اچانک نوجوان رُوپوش ہوگیا۔اب تو سکرین پر لوگوں کی ایک بڑی جمعیت جلوس کی صورت میں دکھائی دینے لگی۔بیچ حصار میں ایک پولیس پارٹی جس کی مضبوط گرفت میں کوئی نا معلوم شخص کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔......اس کا چہرہ کپڑے میں ملفوف تھا اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں ۔ پاس کھڑے دو۲ پولیس کرمچاری دائیں بائیں کندھے پکڑے آگے دھکیلتے ہوئے اُسے شہر کی پولیس اسٹیشن میں لے جا رہے تھے۔

پھر جونہی کیمرے کا زاویہ بدلا تو سکرین پر کوئی نقاب پوش لڑکی کی مبہم سی تصویر نمودار ہوئی۔جس کو یہ حادثہ پیش آیا تھا۔

میڈیا نے پوری اسٹوری کی اچھی کوریج دی اور دیگر کوائف کی خوب تشہیر کی ۔ ساتھ ہی ریڈر کا حزن بھرا لہجہ اتنا متاثر کن تھا کہ لگتا تھا جیسے وہ ان بدمعاشوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لے گا جنہوں نے صنف نازک کو ایک کھلونا سمجھ رکھا ہے۔

اتنا سنتے ہی اسکی آنکھوں سے دو۲ آنسو ڈھلک کر اسکے رخساروں پر بہنے لگے۔وہ تھوڑی دیر کیلئے مبہوت سی بنی دیکھتی رہ گئی پھر جونہی اس واقعے کی تفصیل جاننے کے لئے اسکے دل میں اضطراب بڑھا تو اُس نے فوراً سامنے پڑا ایک اُردو اخبار اٹھایا اور خبروں پر ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔اخبار کے اولین صفحہ پر عصمت ریزی کے اس واقعہ کی تفصیلات درج تھیں۔ ''کل شام پیش آئے اجتماعی عصمت ریزی کے خلاف شہر میں کشیدگی پھیل گئی ہے......'' پڑھتے پڑھتے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہوگئی۔

اِدھر کچھ دیر تک خاوند کی بے نیازی اور خاموشی نے بھی اُس کے معصوم احساسات کو یکسر سنجیدہ اور تجسس آمیز بنا دیا تھا اور پھر اس واقعہ کی گونج نے بھی اُسے جڑوں سے ہلا دیا تھا۔مانا کہ اس دوران ان کے درمیان کوئی ایسی بات نہیں ہوگئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ختم ہی کر ڈالتی ۔اس کا اپنا ہی قصور تھا۔خوامخواہ اس پر شک کرنے لگی۔ چند ساعتوں

تک اسے کنکھیوں سے دیکھتی رہی۔ مارے خوف اور نفرت سے اس کا سارا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔ اس نے جھٹ اپنے ڈوپٹے سے پسینہ خشک کرنا شروع کر دیا۔ پھر بھی غم اُسے چمٹ کر رہ گیا۔ نہ جانے کتنے دیر تک وہ رہ رہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ غرض اس کے خیال سے یہ واقعہ اُسے چت کر دینے کے لئے کافی تھا۔

ابھی وہ محو حیرت تھی کہ اسکے دل کے نہاں خانے میں نفرت کی ایک دبی سی چنگاری سُلگ اٹھی جو ایک ہولناک شعلے میں بدل کر اسکے دامن تک پھیلتی چلی گئی اور اب اندر کی عورت پر گہری چوٹیں مارنے لگی تھی۔ جیسے کسی ایسی بھولی ہوئی داستان کو یاد کرنے پر اُکسا رہی تھی۔ جس کے کرب وضرب نے اسکی روح مکدر کر کے رکھدی تھی۔

اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب اُس نے آنکھوں کے سامنے سے اخبار ہٹایا۔ بار بار کی چوٹوں سے اسکے ذہن میں وہ الا بلا خیال در آیا تھا۔ اُس دل آزار واقعہ کو گزرے زمانہ بیت گیا۔ کئی موسم آئے گزر گئے۔ آج سب کچھ بُھلا کر بس اتنا یاد رکھا تھا کہ وہ دو ۲ معصوم بچوں کی ماں اور رحم دل انسان کی رفیقہ حیات ہے۔

چند لمحوں تک وہ دوبارہ سکرین کی جانب بڑے اہمناک اور متجسس نظروں سے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ سکرین سے جلوس کا منظر کب کا ہٹ چکا تھا اور اسکی جگہ ایک حسین وجمیل لڑکی پانی کے ٹب میں اشتہا انگیز حالت میں نہاتی نظر آئی۔ تف ہے، ایسے غیر شائستہ مناظر سے مرد وزن میں ذہنی انتشار نہ پھیلے تو کیا ہو اور کیا عجب کہ یہ معاشرے کو بگاڑنے کی سوچی سمجھی سازش ہی ہو۔ ٹب میں نہاتی نوجوان لڑکی بھلے ہی روپیوں کے کرارے نوٹ پانے کی لالچ میں کسی صابن کمپنی کی تشہیر کے لیے عریاں ماڈلنگ کر رہی ہو مگر یہ بھی تو سوچا جائے کہ کمپنی کے فائدے کے چکر میں معاشرے کی کیا گت بنتی ہے۔

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ ایسا گھناونا سین دیکھکر اسکی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ خون کے لت پت سمندر میں اس کی آنکھوں میں انو پاریکھا اور سرجیت کور کا چہرہ سما گیا۔ ان چاروں کی جوڑی سارے کالج میں مشہور تھی۔ لڑکے لڑکیاں ان کی دوستی پر رشک کیا کرتے تھے۔

دل کا کوئی ٹوٹا تار رنج اٹھتے ہی اُسے وہ دن یاد آیا۔ جب انوؔپا اور ریکھؔا کو اپنے بھولے پن کی سزا ملی تھی اور کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہی تھیں۔ سرجیت کور نے پنجاب جا کر شادی رچائی اور پھر وہیں کی ہو کے رہ گئی۔ وہ خود اکیلی کیا کرسکتی تھی؟ مجبوری کی حالت میں تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑی۔ نتیجہ بدنامی کے ڈر نے ان کی دوستی میں دراڑ ڈال دی تھی جو بربادی و علیحدگی کا سبب بن گئی تھی۔

یہ سب یوں ہوا کہ کالج کا سالانہ امتحان قریب آرہا تھا۔ سبھی لڑکے لڑکیاں امتحان کی تیاری میں مصروف تھے۔ کسی وجہ سے وقت مقررہ سے پہلے نصابی کتاب کا ایک باب پڑھنا باقی رہ گیا تھا جسے پورا کرنا لازمی تھا۔ اُس روز کلاس میں انہیں تاخیر ہوگئی۔ پھر جونہی کلاس روم سے باہر نکلیں تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ ابھی شام نہ ہوئی تھی۔ البتہ اجالے کا وجود ہلکی ہلکی تاریکی میں تحلیل ہو رہا تھا۔ وہ کالج سڑک پر تیز تیز ڈگ بھرتی بس اسٹاپ کی جانب روانہ ہوئیں۔ بس اسٹاپ کوئی ڈیڑھ کلومیٹر کی دُوری پر تھا۔

کالی گھٹا برسنے کو تیار تھی کہ اگلے ہی پل موسلا دھار بارش ہوئی۔ تینوں بھیگنے لگیں چلنا دُوبھر ہو گیا تھا۔ اسکے باوجود وہ آگے بڑھتی رہیں۔ برستے پانی میں تینوں جھیل میں کھلے کنول کی طرح حسین دلکش لگ رہی تھیں۔ بارش کے شرارتی قطرے ان کے دمکتے ہوئے بدن پر گرتے رہے اور چہرے سے موتیوں کا روپ دھار کر گالوں پر سے لرزتے کانپتے ٹپکنے لگے۔ جیسے صبح کاذب کے شبنمی قطرے انگڑائیاں لے رہے ہوں۔

دفعتاً عقب میں ہارن بجاتی ہوئی ایک چمچماتی تیز کار سوار نے پاس آکر کار روک دی کھڑکی کا شیشہ گرا اور پھر اندر سے کوئی جھانکتا چہرہ باہر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا......

''میڈیم! مجھے گاندھی نگر تک جانا ہے۔ بُرا نہ مانو تو وہاں تک لفٹ دے سکتا ہوں۔ پتہ نہیں بس کب آئیگی۔''

دیکھا تو کالج کے دو ۲ ساتھی جن میں منوہرؔ ڈرائینگ سیٹ پر اور رمیشؔ اسکے پہلو میں براجمان تھا۔ بڑے ہنس مکھ اور دلدار قسم کے نوجوان تھے۔ کبھی کبھی کسی کا ہاتھ بٹاتے

گڈوش اور دعائیں لیتے رہتے۔

''نو تھنکیس! بس اسٹاپ زیادہ دُور نہیں۔ ممکن ہے، بس بھی آتی ہی ہو۔'' انوپا گھبراتی ہوئی بولی۔

''دیکھو انوپا۔ رمیش راستے میں اتر رہا ہے اور جگہ بھی خالی ہے......'' منوہر باہر کھڑکی سے اپنا سر نکال کر کچھ متانت لہجے میں بولا۔'' پھر موسم اور بس پر کوئی بھروسہ نہیں ہوتا ہے۔ جانے کب کونسا روپ دھار لے گا۔''

اس دوران بارش کے چند منچلے شرارتی چھینٹے اسکے چہرے پر آ گرے تھے جو اُسے ناگوار لگے۔ اُس نے فوراً اپنا سر مزید بھیگنے کے ڈر سے اندر کار میں چھپا لیا اور جیب سے ہنکی نکال کر ماتھا اور چہرہ صاف کرنے لگا۔

''کہو تو میں یہیں بس سٹاپ پر اتر جاؤں۔ پھر بے خوف ہو کر آپ جاسکتی ہیں۔'' رمیش نے یقین دلایا۔

''نہیں۔ ایسی بات نہیں''۔ ریکھا جو ابھی تک تماشائی کی طرح انکی باتیں سن رہی تھی۔ بیچ میں بولی۔

جانے ان دونوں کی آواز میں کیا جادو بھرا تھا کہ انوپا کا دل نرم ہو گیا۔ اس نے جھٹ ہامی بھر لی اور انکے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی ریکھا بڑی حیرت سے اسکا منہ دیکھتی رہ گئی۔ اُس نے منوہر سے نظریں بچا کر انوپا کی کمر میں چٹکی لی پھر کانا پھوسی کے انداز میں دھیرے سے بولی۔

''یہ کیسی بچگانہ بات کر ڈالی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ہم کوئی خطرہ مول نہ لیں تو اچھا ہے۔''

''بھئی! کب تک یونہی سرِ راہ بارش میں بس کا انتظار کرتی رہو گی۔ ویسے سنا ہے کہ یہ دونوں بہت شریف ہیں۔'' انوپا کے جواب نے ریکھا کو لاجواب کیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے انوپا آگے بڑھی اور بڑی پھرتی سے کار کی پچھلی کھڑکی کھول کر سیٹ میں دھنس گئی۔ درخشندہ نے اسٹاپ کی بس قریب آتی دیکھی تو اس میں سوار ہو کر وہ بھی

وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اتفاق سے اس رُوز سرجیت کور بیماری کی وجہ سے کالج نہیں آسکی تھی۔

راستے میں درخشندہ سوچ میں گم رہی۔ اُسے خدشہ ہونے لگا کہ جو جوکھم اسکی سہیلوں نے اٹھایا۔ وہ صحیح تھا یا غلط۔ وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غوطہ زن رہی۔ پھر جب کوئی فیصلہ نہ کر پائی تو اس خیال کو ذہن سے مار بھگایا۔ مگر شک کا کیڑا تھا کہ دماغ میں رینگتا ہی رہا۔ آخر تنگ آکر اس نے یہ معاملہ خدا اور تقدیر کے سپرد کرنے میں ہی عافیت جانی۔

دوسرے دن خوشگوار موسم کے باوجود درخشندہ کا چہرہ کمھلایا ہوا تھا۔ صبح سے ہی انوپا اور ریکھا کی سدھ بدھ نہ ملی تھی۔ اس نے کالج کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لائبیریری اور کنٹین کو بھی نہ چھوڑا۔ جہاں جہاں انکے ہونے کا امکان تھا۔ وہاں وہاں دیکھا۔ مگر نتیجہ ناکامی......! وہ ان کے بغیر تنہا محسوس کرنے لگی اور سارے، کالج سے اجنبت سی جھلکنے لگی تھی۔ اُس نے موبائیل اٹھایا۔ دونوں کو بار بار فون کیا۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ سرجیت کور سے کچھ آخری اُمید بندھی تھی مگر وہ پچھلے چند دنوں سے بیمار چلی آرہی تھی۔ لہٰذا اُس سے پوچھ لینا بیکار تھا۔

وہ ایک عجیب موڑ پر آکر کھڑی ہوگئی۔ جہاں وہ اپنے آپکو بالکل بے بس محسوس کر رہی تھی۔ آگے پیچھے ایک ایسی محرومیت کا احساس ہوگیا جیسے سارے ماحول میں دُور دُور تک سناٹا ہی سناٹا پر ہول سناٹے کے سوا کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو۔ اب وہ کالج میں مزید رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے کچھ سوچے اور کچھ لمحہ ضایع کئے بغیر واپس اپنے گھر جانے کے لئے من بنالیا۔

ابھی وہ اس پریشانی سے دُوچار تھی کہ اُسے دُور سے لکچرار حمید آتا دکھائی دیا۔ وہ ہمیشہ سمارٹ دکھائی دیتا تھا۔ اسکی شخصیت بڑی دلنواز تھی۔ میانہ قد۔ گول چہرہ۔ گندمی رنگ، چوڑی پیشانی سنہرے خوبصورت فریم کی دیز شیشوں والی عینک سے جھانکتی ہوئی دو ۲ آنکھیں اور پتلے باریک ہونٹ جب جنبش کرتے تو خوبصورت باتوں کی پھلجڑیاں سی بکھیر جاتی۔ مانو لکچر میں اتنا تاثر بھرا جادُو کہ منٹوں میں ٹیوٹر پر چھاپ پڑ جاتی اور پھر اس کی قابلیت اور صلاحیت کے چرچے سارے کالج میں اس قدر ہونے لگے تھے کہ سارے سٹاف میں اسکی

قدر و منزلت بڑھ گئی تھی۔ اپنی فرض شناسی اور قابلیت بھری صلاحیت کے باوجود درخشندہ اسکے دل و دماغ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ یعنی وہ یک طرفہ محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ جب کہ درخشندہ اسکے دل کی حالت سے بالکل نا آشنا تھی۔ پھر بھی خوش نصیب تھی کہ ایک نیک سیرت لکچرار کے محبت بھرے دل میں جا بسی تھی۔

جانے کیسے اور کیونکر وہ اسکے غم میں روگی ہو گیا تھا۔ پیرڈ Period کے ختم ہوتے ہی اس نے درخشندہ کو کچھ پوچھنے کی غرض سے برآمدے میں رکنے کا اشارہ کیا تو وہ انکار نہ کر سکی۔ اکیلے پڑے رہنے کی نسبت تو اس کے ساتھ باتیں کرنا ہی مناسب تھا۔ وہ مان گئی مگر اُسے کیا خبر تھی کہ اسکی بات اس پر برق کی طرح گر کر اسکی دنیا ہلا کے رکھ دے گی۔ بات سنتے ہی اسکے چہرے کی لالی عنقا ہو گئی۔ جذباتی اور آبدیدہ ہو کر وہ کسی ہونق کی طرح اُسکا منہ تکتی رہ گئی۔

پہلے تو اُسے یقین ہی نہیں آیا۔ لیکن جب ساری سچویشن سن کر محتاط رہنے کا مشورہ ملا تو ایسی لرزی کہ پسینے میں شرابور ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ چہرے کا رنگ فق پڑ گیا۔ جانے اس بات کی بھنک لکچرار حمید کے کانوں میں کیسے پڑی تھی۔

معاملہ گذشتہ شام کا تھا۔ جب لفٹ لینے کے بعد انو پا اور ریکھا پر سیاہ آندھی کا قہر ٹوٹا تھا۔ ایک مقامی ہوٹل میں چائے میں نشہ آور گولیاں ملا کر انہیں پلا دی گئیں۔ اور وہ دونوں وہیں لڑکھڑائی ہوئی بے ہوش ہو کر گر پڑیں تھیں اور پھر بدنصیب کلی کھلنے سے پہلے ہی مسلی گئی۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں۔

یہ اندوہناک خبر سن کر درخشندہ کا چہرا اتر گیا۔ اُسے انو پا اور ریکھا کا دکھ اور صدمہ ستانے لگا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات اٹھنے لگے اس لئے وہاں دیر تک رہنا برداشت نہ کر سکی۔ کسی طرح سے گھر پہونچنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ پھر بھی رہ رہ کر اسکے دل میں جو کھٹکا لگا رہتا ہے۔ بے آب مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی جس سے اُسے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔

اچاٹ من کے سبب وہ کئی دنوں سے کالج بھی نہ جا سکی تھی اور پھر گھر میں اسکی ماں کی

طبعیت خراب چل رہی تھی۔ بار بار اُٹھتے بیٹھتے ،سوتے جاگتے دماغ میں طرح طرح خیالات شکاری کتوں کی طرح اس کا تعاقب کرتے رہتے مگر کس سے وہ اپنے حال کا حال بیان کردے۔ کہیں وہ اُسے دماغی فتورنہ سمجھ بیٹھیں اوراس طرح دل کی بات دل میں گھٹ کر رہ گئی۔

ایک دن ابا حضور ماں کو میڈیکل چک اپ کے لئے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔اب گھر میں تن تنہا اور اکیلی رہ گئی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ سارے گھر میں سب کچھ خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندر خالی کمرے بھائیں بھائیں کررہے تھے یعنی اندر تاریکی او باہر گھپ اندھیرا۔غمزدہ اداسی دہلیز سے لگ کر جیسے اونگھ رہی تھی۔ وہ پلنگ پر دراز کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر خمار چڑھا اسکے وجود کو بوجھل کرگئی تھی۔ اچانک اُسے یوں لگا جیسے باہر کوئی دستک دے رہا ہو۔ پھر کمرے کے باہر چڑ چڑاہٹ کی آواز نے اسکا دھیان اپنی اور کھینچ لیا ہو جسے سنکر خوف کی لہر سی اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ تھوڑے توقف کے بعد جونہی دھڑام سے کمرے کا دروازہ کھلا تو آن واحد میں دو۲ نقاب پوش اندر داخل ہوگئے۔ وہ انہیں یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر کچھ گھبراسی گئی اوراسکے ہوش اڑ گئے بدحواس سی خود کو انکے عقاب سے بچانے کے لئے دوسرے کمرے کی جانب بے جونہی بھاگنے کے ارادے سے اٹھی کہ اس نے ہر سو خطرہ منڈلاتے ہوئے دیکھا۔ وسوسوں نے آگھیرا۔ جس نے اسکے ہاتھ پاؤں شل کر دیئے۔ یہ سب اتنی جلدی میں ہوا کہ اُسے بھاگنے سمجھنے یا کچھ سوچنے کی مہلت بھی نہیں مل پائی کہ تنہائی کا فائدہ اٹھا کر ایک نے بری طرح دونوں بازو کس کے اُسے دبوچ لیا جب کہ دوسرے نے پتلون کی جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اگلے ہی پل دنیا ومافیا سے بے خبر اس کی حالت زدہ پتے کی جیسی ہوکر رہ گئی۔

لیکن پھر جیسے وہ ہوش میں آئی تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے کی ہر چیز دھندلی دھندلی سی دکھائی دی اسکا دل دھک سے رہ گیا۔ لگا کہ جیسے اسکی زندگی میں کوئی بھونچال سا آگیا ہو یعنی زندگی بے معنی سی ہوکر رہ گئی ہے۔ اُسے اپنے وجود نے مایوس و

مغموم کر دیا اور ہر خواہشیں نہس کر کے جیسے کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں کہ اب نفرت کے سوا اس کے پاس کچھ ہی نہیں بچا تھا اور اب تو زندہ رہنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ اتنا ہو کر وہ کس طرح زندہ رہی پھر جب اس نے اپنا ہوش سنبھال کر اپنا جایزہ لیا اور اپنی موندتی ہوئی آنکھوں کو مسل کر چاروں اور دیکھا تو اُسے کھڑکیوں کے باہر شیشوں سے آسمان بالکل صاف اور کورا نظر آیا۔ بادلوں کا کہیں دُور دُور تک کوئی نام ونشان تک دیکھا اور نہ ہی موسم اچانک بدلا ہوا پایا۔ زندگی میں جو طوفان سا آیا تھا۔ وہ پلک جھپکتے ہی گزرا۔ جس سے ان کی زندگی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ سوائے وہم کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

وہ دیر تک اتنا پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ آنسوؤں سے اسکا دامن تر ہو گیا۔ اسکی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اُسے کسی سہارے کی ضرورت ہے جو بہلائے سہلائے اور دل جوئی کر کے اسے چپ کرا دیتا مگر کوئی پاس بھی ہوتا۔ تھک کر اس نے زہر کا گھونٹ پی لیا اور جلے ہوئے ارمانوں میں بسے۔ خوابوں اور خیالوں کی لاش کو سینے میں دفنا دیا۔

وہ سوچنے لگی اور سوچتی رہی۔

ابھی وہ اس خیال سے ذہن کو نجات بھی دلا نہ سکی تھی کہ بیٹھے بیٹھے اس کی آبدیدہ نظریں سامنے رومال پر جا پڑی۔ دیکھا تو اس کے ایک کونے پر حرف ''ایم'' جیسا نشان کندہ تھا اور ابھی اس چیز سے کسی بدبو اور گندی باس کا تھوڑا سا اثر باقی تھا۔ اب تو اسکا شک یقین کی حد کو چھونے لگا کہ اس گھناونی سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے اسکی زندگی کی بساط الٹ کر سارے سپنے بکھر دینے کی کوشش کی ہو۔ اس کی نظروں میں ایک کے بعد ایک رمیش اور منوہر کی صورتیں گھومنے لگیں۔

درخشندہ جتنی نفاست پسند تھی اتنی صابر اور شاکر بھی۔ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا تو اُسے آتا ہی تھا اور پھر کسی مصیبت کے وقت عقل سے کام لینے کا گُر بھی جانتی تھی۔ اس نے جلد ہی نجانے کیا سوچ کر خود پر قابو پا لیا۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا رہا۔

درخشندہ کوئی پتھر کی مورت نہ تھی کہ آگ کی تپش محسوس نہ کرتی بے حس ہو کر رہ جاتی وہ کب تک اپنے دل کو بہلاتی اور پھسلاتی رہتی۔ کوئی حد بھی ہے۔ پہلے پہلے ایک عرصہ تک وہ اس غم کو سہہ سکی۔ اپنے آپ سے جوجھتی رہی۔ اندر ہی اندر ٹوٹتی اور بکھرتی رہی۔ تب جا کر اسے زندگی کا مفہوم سمجھ میں آیا کہ دکھوں کے پیچھے بھاگنا تو زندگی کا مطلب نہیں اور کسی سے انتقام لینا یا کسی کو بددعا دینا واجب بھی نہیں۔ اس نے انوپا اور ریکھا کی خود کشی کرنے کی خبر سن لی تھی ان کو کچھ حاصل نہ ہوا تھا اور نہ ہی ان بدچلن لوگوں کا کچھ بگڑا تھا۔ جنہوں نے دو۲ معصوم شگوفوں کو اپنے قدموں تلے روندا اور مسل دیا تھا۔ واویلا کرنے سے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ اس طرح اس نے ہمت نہیں ہاری اور نہ صبر کا دامن چھوڑا۔ والدین کی لاج بچالی۔ اپنا وقار بحال کئے رکھا۔

دھیرے دھیرے اس کے رستے زخم بھرنے لگے۔ نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ پڑھائی چھوڑ کر وہ گھر کے کاموں میں جٹی رہنے لگی۔ اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ خواہ کچھ بھی ہو اب وہ اس حادثہ کے متعلق کسی کو نہیں بتائے گی اور نہ ہی اسکا خیال کبھی دل میں لائے گی۔

اس کا خیال تھا کہ معاملہ طول پکڑنے کے بجائے اپنے آپ ٹھنڈا ہو گیا ہے اور کسی کو کانوں کان ان کے بات کی بھنک نہیں لگی ہے۔ وہ مطمئن دکھائی دینے لگی۔ درد و کرب کے خوف کا جو بادل سر پر منڈلاتا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید آسمان والے نے اپنے دائیرے میں سمیٹ کر پھیلنے نہ دیا۔

کرنا خدا کا ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ لکچرار حمید نے شادی کا پیغام بھجوایا۔ درخشندہ کو ایک اچھا موقع مل گیا۔ اس نے بلا جھجک جھکے سے ہامی بھرلی اور اس سے شادی کے لئے رضامند ہوگئی۔

آج جب کہ درخشندہ کو اپنی بیتی ہوئی اس منحوس گھڑی کی یاد آئی تو اس کا من رو پڑا اور پھر دل ہی دل میں روتی رہی۔ آنسو بہاتی رہی۔ زمانے کی زہر آلود آندھیوں نے اس کے دل کے آنگن میں گرد جو اڑائی تھی۔ ایک کربناک سانحہ نے اس پھول کی مٹی کے تہہ کو

کھیڈ یڑ کر اسکی یاد تازہ کرادی۔

سوچتے سوچتے اس کے دل میں جیسے کوئی چور چپکے چپکے سے گھس آیا کہ وہ کانپ سی گئی۔لرز گئی اور اپنے اندر ایک عجیب قسم کی سی بے چینی کی کیفیت محسوس کرنے لگی۔

اُسے خدشہ ہوا کہ کہیں یہ بھید لکچرار حمید پر کھل نہ جائے اور اس کی زندگی اجیرن نہ بننے۔ایک اچھا ہنستا مسکراتا گھر اجڑ جائیگا تو اسکی آگ میں وہ ساری عمر جلتی رہیگی۔سلگتی رہے گی۔

اسی اثناء میں اب ٹی وی پر کوئی دوسرا پروگرام آیا۔لیکن درخشندہ اس بات سے بے خبر اپنے انہی خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔جس نے اس کے ذہن اور روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا کہ وہ اپنے ہی گھر میں خود کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگی جیسے یہ حادثہ ابھی ابھی پیش آیا ہے یا آنے والا ہو۔

کافی دیر تک لکچرار حمید نے اس دوران اپنی گہری ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے اسکا چہرہ جیسے پڑھ لیا تھا اور اس کی اندرونی کیفیت کو جیسے بھانپ لیا ہو۔

حقیقت لاکھ چھپاؤ نہیں چھپتی، یہ سوچ کر لکچرار حمید اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی جانب بڑھا۔تاکہ اسے تسلی دیکر اس کے پرانے زخموں کو مندمل کر سکے۔پاس آکر اس نے درخشندہ کا سر اپنے چوڑے سینے میں چھپا لیا۔پھر آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔اسکی کمر تھپتھپائی۔دل ہی دل میں اس کی بچگانہ حرکت پر پچھتا تا رہا اور پھر زیر لب بڑبڑایا۔

میں نے تجھے پانے کے لئے دنیا بھر کے دکھ جھیلے ہیں۔اپنا سب کچھ گنوا کر سپنوں کا ایک محل بنایا ہے۔لیکن تم آج بھی اُس نا کردہ گناہ کے لئے پشیمان ہو جو تم نے کیا ہی نہ تھا اور اس میں تمہارا کوئی قصور بھی نہ تھا۔کب تک اس کہانی کو دل میں چھپاتی اور دباتی رہوگی۔کب تک اس آگ میں جلتی رہوگی۔؟

میں یہ جان کر بھی آج تک خاموش رہا۔تاکہ پختہ دیوار میں کوئی رخنہ پیدا نہ ہو

جائے۔ جسے ایک عرصہ سے ہم دونوں نے کھڑی کی ہیں۔ اور نہ ہی میں یونہی کسی کا دل دکھانا چاہ رہا ہوں۔

لکچرار حمید کو معلوم ہو گیا تھا کہ اپنے بچاؤ کے لئے آدمی کسی حد تک گر سکتا ہے۔ چپ رہنے کی قیمت چکانے کے لئے ڈرانے اور دھمکانے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے اور پھر اس گھناونی سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟

اُسے یقین کرنا پڑا کہ ان دو بدماشوں نے ہی یہ کھیل کھیلا تھا۔ شاید انہیں اس میں اس کا بدن چھونے کا ارادہ تھا اور نا ہی اس کے پیچھے کوئی انتقامی جذبہ کارفرما تھا۔ البتہ دھمکانے اور ڈرانے کا کسی حد تک عنصر موجود لگ رہا تھا۔ ورنہ صنم ہم تو ڈوبے ہیں تجھے بھی ڈوبو دینگے کے مصداق وہ ناکام و نامراد بغیر کوئی گزند پہنچائے کیوں لوٹ کر آ گئے تھے۔ یہ بات لکچرار حمید کو اپنے ایک پولیس انسپکٹر دوست نے ایک دن معاملے کی تفتیش کے دوران پورے اعتماد سے بتائی تھی۔ چونکہ درخشندہ کا باپ ایک ذی عزت شہری تھے اور ان کی رسائی اوپر تک جاتی تھی۔ لہٰذا پولیس نے اس کیس میں اس دھمکی کا کوئی نوٹس نہ لیا اور دوسری بات یہ کہ ثبوت کے طور کوئی گواہ بھی سامنے آیا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی رپورٹ تھانے میں درج ہوئی تھی۔ پھر جیسے ہی لکچرار کے لب کھلے تا کہ اس کے ذہن پر سے وزنی پتھر کے خوف کا بھر کُس نکال لے جو اُس کے دل پر ایک نامعلوم بوجھ کے مانند پڑا تھا۔ جس کے نیچے سینکڑوں سوالات غلیظ اور گندے پانی کے کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے۔ اس کی آواز گم ہوگئی کہ وہ کچھ بول بھی نہ پایا۔ بے بس ہو کر وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اسے لگا اندر ہی اندر ٹوٹ کر اس کا سارا وجود ڈل کے منجمد پانی میں ایک تودہ کی طرح بکھیر گیا ہو۔

اسی اثناء میں اچانک درخشندہ کیا سوچ کر وہاں سے اٹھی اور اسکے لئے ناشتہ پکانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔!!

............☆☆☆............

حرف ناشیدہ

وہ لمحہ ایک سانحہ سے کم نہ تھا جوانجانے میں اُسے چھوکر گزرا۔جس نے اسکے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ کرر کھ دیا تھا۔اب وہ لمحہ یاد کرنے سے کیا فائدہ......؟

بولنے کوتو بول گیا ایک روز جب وہ اسکے خواب وخیال میں تتلی بن کر اپنی کنواری خوشیوں کے ساتھ آئی۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب اور کیسے دل میں آن بسی۔ بھلا اُسے وہ کیسے روک سکتا اُسے معلوم تھا کہ اسکے دل میں بھی آگ لگ چکی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں نے اپنی اپنی مہربانیوں کے دریچے کھول دیئے اور ایک دوسرے کے دل میں ارمانوں کے قندیلیں روشن کر دیں۔ منزل کو پانے کی خواہش تھی اس لئے شوق میں آگے بڑھتے رہے۔ وقت کیسے پنکھ لگا کر اڑ گیا۔ پتا ہی نہ چلا۔

آج اچانک اس کے بدلے بدلے سے تیور دیکھے تو وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے اُسے اسکے پیار پر بھروسہ اور اعتماد نہ رہا ہو اور اس سے زیادہ کی توقع کرنا بھی سراسر بے وقوفی تھی ابھی وہ اس ادھیڑ بن میں جواب ڈھونڈنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اُسے یاد آیا۔

اُس دن وہ ریلوے اسٹیشن پر کوئی دو گھنٹے سے اس کے انتظار میں کھڑا تھا اور اُسے ایک ایک لمحہ پہاڑ جیسا لگ رہا تھا۔ تکان سے سارے بدن کا توازن اس قدر بگڑ گیا کہ پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے اور سیدھی سپاٹ کمر دوہری ہونے لگی تھی۔ ٹکٹکی لگائے دیکھنے سے آنکھیں سوجن کی ناقابل برداشت تکلیف میں دکھ رہی تھیں۔ دل وذہن کی کیفیت کچھ اس طرح کی تھی کہ جیسے کوئی خاردار جھاڑی میں ریشمی رومال پھنسا کر کھینچ جا رہا ہو اب وہاں

دیر تک ٹکا رہنا اُس کے لئے مشکل ہو گیا تھا اور وہ اسا اطیری پری کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جب کہ اُس نے اُسے دو دن پہلے اپنی زبان دے دی تھی۔ کوئی اپنا ہوتا جو اُسے یہ سب کچھ بتا دیتا اور وہ فوراً آ کے گلے لگ جاتی۔ ہائے کیسے بیان کرے کہ یقین اور بے یقینی کے صلیب پر کھڑا اسکا وجود لرز لرز رہا تھا۔

سوچتے سوچتے اچانک دل کتاب سے ہاتھ چھو گئے اور اس کے اوراق خود بخود پلٹنے لگے۔ پہلا ہی ورق پڑھا کہ جوانی کا وہ دن آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ جب پہلی بار اُس نے اُسے پولیس ہیڈ کواٹر کے باہری سڑک پر کسی پولیس کی کار سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اپنی نظریں نیچی کئے گیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی۔ نہایت چست لباس زیب تن کئے اس کے شانوں پر سنہرے گھونگریلے بال بکھرے ہوئے تھے اور ڈوپٹہ گلے سے لپٹا تھا۔ بڑی خوبصورت اور اسمارٹ لگ رہی تھی مانو کسی جنت کی حور سے کم نہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسکے ہوش اڑا کر لے گئی۔

پھر جب گیٹ کے سامنے کھڑی بلڈنگ کی چڑھتی ہوئی سیڑھیوں تک راہداری میں چلتے چلتے اس کی ایک دو بار جھکی جھکی خموش نظریں اسکی جانب اٹھیں تو اُسے ایسا لگا کہ جیسے وہ ہر بار اس کی ترچھی نظروں کی زد میں آ کر گھائل ہوئے جا رہا تھا۔

دراصل آصف یہاں حصول نوکری کے سلسلے میں فارم بھرنے کے لئے آیا تھا اور قطار میں کھڑا ہو کر اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ سامنے کمپاونڈ میں اسکے جیسے بیسویں پڑھے لکھے بے کار نوجوان اِدھر اُدھر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے مختلف موضوعات پر بحث کر رہے تھے اور کافی الجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اُن سے کچھ اور ہی سوچنے میں محو تھا......!

نجانے اس شعلہ بدن میں ایسی کیا مقناطیسی کشش تھی کہ آصف پہلی ہی نظر میں اس کی طرف کھنچتا چلا گیا......اور اسے اپنے من مندر میں بسا لیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایم۔ اے کرنے کے بعد بے کاری سے تنگ آ کر وہ نوکری کی حصول میں دفتروں کا چکر کاٹ لیتا تھا اور پھر جہاں جہاں کہیں خالی موزوں اسامی کی جگہ دیکھ لیتا تو فوراً وہاں جا کر فارم بھر دیتا تھا۔

اس بھاگ دوڑ میں وہ اچانک کہیں نہ کہیں نظر آتی ہی تھی۔ کبھی ایسا ہوا کہ وہ کسی بس اسٹینڈ پر کھڑی ہے کبھی کسی دکان میں سودا خرید لیتی ہوتی ہوئی کبھی راہ پر چلتے چلتے جا رہی تھی۔ کبھی کھنکھیوں سے گھورنے کے انداز میں اور کبھی والہانہ نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتی...... کمال کی بات یہ تھی کہ اُسے آصف کے دل کی بات کا اندازہ لگانے میں مشکل نہ ہوئی۔ اُسے اُس کے ساتھ ایک والہانہ لگاؤ سا پیدا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ وہ موم کی طرح پگھلنے لگی اور اُس سے اپنے قوس قزح کے رنگوں میں سمیٹنے لگی۔ یوں سمجھو کہ وہ تو بس پیار و محبت کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو کر رہ گئی۔ شاید یہاں یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ عورت اپنے حسن و خوبصورتی پر ناز کرتی رہتی ہے اور جب اس کے جذبات اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں تو وہ کسی بھی مرد کی بانہوں میں کچی ٹہنی کی طرح جا گرتی ہے بچاری جوان لڑکی تھی وہ...... اس کے سینے کے اندر جذبات پھڑ پھڑا رہے تھے۔ جیسے چولھے پر دودھ کی اُبلتی ہوئی ہانڈی سے دودھ کے قطرے ٹپکنے سے بھلا کیا روک پا سکتی تھی۔

''یہ تو شروعات تھی۔ پھر وہ دونوں جب بھی ملتے تھے۔ کبھی کسی ہوٹل سرکاری پارک یا شہر کے باہر سڑک کے کنارے کوئی ویران سی جگہ پر راز و نیاز کی باتیں ہوا کرتی تھی۔

آپ نے بہت سی کہانیاں پڑھی سنی ہوں گی نئی اور پرانی...... جیسے لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، شرین فرہاد انارکلی اور یہی مال ونا گرائیے کی داستان۔ ان کہانیوں کے کردار جو اپنے محبوب کے انتظار میں اکثر دیوانے ہو چکے تھے یا اینٹوں کی دیوار میں چنوا دئے گئے...... جو کبھی جنگلوں، بیانوں اور تپتے ریگستانوں میں بھٹکتے پھرتے رہتے اور کبھی خاموش درختوں تلے چاندنی راتوں میں مدبھرے رسیلے گیت الاپتے رہتے تھے۔ اُن ہی کی طرح ان کی ملاقاتیں بھی اکثر بلیوارڈ۔ باغ گل لالہ۔ اقبال پارک یا نہرو پارک میں ہوا کرتی تھیں یا پھر کسی چنار پیڑ کے چھاؤں تلے ایک دوسرے کے قُرب میں بیٹھے بیٹھے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔

اس طرح رفتہ رفتہ محبت پروان چڑھتی گئی اور یوں ملاقاتوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ رفاقت اتنی بڑھ گئی کہ انہیں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان

دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کا عہد کیا۔ پھر ایک دن طے ہوا کہ اپنے شہر سے اپنے گھر سے بھاگ کر دور کہیں اپنا الگ گھر بسا لیں گے۔ جہاں اپنا مکان ہوگا، ایک آنگن ہوگا، ایک آسمان، ایک ٹھکانہ اور کیا چاہیئے تھا......؟

اُس دن جب وہ دونوں نگین باغ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر راز و نیاز کی باتیں کرنے میں محو تھے کہ اس نے گیوئے دراز سے لپٹے بدن کو اسکے سینے میں سمو دیا اور بڑے متانت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیا تم ہمیشہ اسی طرح پیار کرتے رہوگے''؟

''ہاں! جانِ من، اس سے بھی زیادہ مگر اتنا ذرا بتا تو، کیا میرے پیار میں کوئی کھوٹ نظر آئی ہے''؟

''نہیں تو۔ مگر میں نے تم جیسا کوئی بدھو بھی نہیں دیکھا ہے۔ میرا کہنے کا مطلب ہے ذرا عقل سے کام لیا کرو'۔

''میں سمجھا نہیں۔ آصف اندر ہی اندر اس کی بات پر جھنجنا اٹھا جیسے کسی مدھو مکھی نے کر اُسے ڈس لیا ہو اور اس کا درد ظاہر بھی نہ کر سکا'۔

''سمجھاتی ہوں عقل تو کہہ رہی ہے کہ اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ چلو کسی بہانے گھر سے بھاگ کر کہیں دور اپنی دنیا بسا لیتے ہیں''۔

وہ اُسے سمجھاتی رہی جیسے کوئی استاد اپنے شاگرد کو سمجھاتا ہے۔ اس نے آنکھیں موند لیں اس کی اس ایک چھوٹی سے خواہش نے اُسے کہیں کا نہیں رکھ دیا۔ بس سوالوں کے بھنور میں پھنسا دیا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر ڈر لگتا ہے۔ کیا پتہ ایسی حرکت سے ہمارے اپنے جان کے دشمن بن جائیں۔ ایسا ہوا تو کیا ہوگا''۔

''تو کیا کریں۔ بھاگنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے''۔

انجام سے بے خبر اس نے نئی زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

''ہاں سوتو ہے''۔اس سے پہلے کہ آصف کچھ بولتا اُس نے اُسکے کئی بوسے لیتے ہوئے کہا۔

''لیکن پھر بھی بکھیڑا کھڑا نہ ہوگا''۔

''نہیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی اور پھر گرجتے بادل زیادہ دیر تک برستے بھی نہیں''۔اچانک اُسے پیار کی وہ سب باتیں یاد آنے لگیں جو وہ دونوں اکثر سیبوں، ناشپاتیوں، اخروٹوں اور بادام کے درختوں کے ہرے بھرے باغوں میں گھومتے اور اترتے ہوئے آبشاروں کے کناروں پر بیٹھ کر کیا کرتے۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ایک دوجے کے لئے بنے ہیں''؟

یہ کہتے ہوئے اس نے آصف کی چھاتی پر اپنا سر ٹیک دیا۔اب کے بار اس کی لبوں پر مسکراہٹ تھی اس کے مسکرانے کا انداز اُسے پسند آیا۔اُس نے زیادہ کھول کر اپنے دل کی بات کہی اور کسی اچھے موقع کی تلاش میں گھر سے بھاگ نکل جانے کے لئے اب تیار کھڑی تھی۔آصف کے دل میں پہلے سے اگر کوئی تھوڑا سا ڈر تھا تو وہ اچانک غائب ہوگیا۔

اگلے دن پروگرام کے مطابق اس نے' ملنے کی کسک لئے' آصف وقت سے پہلے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا اور اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔دیکھتے دیکھتے دو گھنٹے گزر گئے لیکن وہ کہیں دور دور تک نظر نہیں آرہی تھی۔

اتنے میں دوڑتی بھاگتی ٹرین سیٹی بجاتی ہوئی آئی۔ مایوسی کے عالم میں بس وہ اُسے صرف دیکھتا رہا۔

اُس نے کئی بار اُسے فون لگایا مگر ہر بار فون پر کوئی نسوائی آواز کہتی رہی۔

''موبائل وستِ (Engage) ہے۔کرپیا تھوڑی دیر بعد فون کریں''

آصف بے حد پریشان ہوا اٹھا اور سوچتا رہا۔ضرور اس کے موبائیل کی بیٹری ختم ہوئی ہوگی۔اس پریشانی کے عالم میں اُسے کئی وسوسوں نے گھیر لیا پھر وہ خود کو دلاسہ دیتے ہوئے سوچتا رہا وہ مجھ سے رابطہ نہیں کر پا رہی ہے یا شاید یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وقت پر کوئی آٹو

رکشایا بس نہ ملی ہوگی پریشانی سے اب اسکا منہ کلیجہ کو آرہا تھا وہ اپنے گھر جانے کے لے تیار ہوگیا تھا۔

دفعتاً موبائل بج اٹھا اور اس پر مانوس الفاظ کی لکیر نمودار ہوگئی۔ یہ دیکھ کر اسکے جسم میں ایک خوشی کی لہر دوڑتی چلی گئی اور کانوں میں شہنائیوں اور پٹاخوں کی آواز گونجنے لگی۔ منہ سے بے شمار بے رابطہ جملے کسی آبشار کی طرح ,گر پڑے۔

''ہیلو۔ ہیلو'' عجیب قسم کی لڑکی ہو تم ,فون کیوں نہیں اٹھایا ابھی تک۔ جانتی ہو کتنی دیر کر دی تم نے ...... ٹرین بھی کب کی آچکی ہے اور جانے کے لئے تیار کھڑی ہے۔ میں پریشان ہو کر اب تھک گیا۔ آصف نے ایک ہی سانس میں اُس سے ڈھیر سارے بے ترتیب سوالات پوچھ ڈالے۔ جسے سن کر وہ بڑی آہستگی سے بڑی معصومیت سے بولی۔

''کیا کروں اب کی بار عقل ایسا قدم اٹھانے سے روک رہی تھی جب کہ دل نے صلح دی تو میں جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ ارے ہاں ...... جو تم اپنے ساتھ بریف کیس میں دو تین جوڑے کپڑے ایک شال اور سویٹر رکھ لینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے لئے شکریہ۔ ایک چھوٹی سی رقم جو میں نے پس انداز کی تھی۔ وہ ساتھ لائی ہے''۔

یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل بند کیا تھا۔ اس کی آنے کی اطلاع سنتے ہی اسکے اندر جو بے قراری تھی وہ ایک دم دور ہوگئی اور اسکا دل بلیوں اچھلنے لگا......

تھوڑی ہی دیر جب وہ آٹو رکشا سے اُتری۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کا بریف کیس تھا۔ اتر کر پہلے اِدھر اُدھر ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی اور پھر کسی سوچ میں پڑ گئی۔

آصف اُس پر نظر ڈال کر چکرا گیا۔ واقعی وہ اس وقت سبز پری معلوم ہو رہی تھی۔ سبز فراک سبز شلوار اور ہلکا سبز ڈوپٹہ اسکے گورے گورے بدن پر پھوٹا پڑ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک اور چہرے پر تازگی تھی۔ کم از کم بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا اس نے ایک ٹک اُسے دیکھا......

وہ بڑی سبک رفتاری کے ساتھ اس کے مد مقابل پلیٹ فارم کی جانب بڑھی کہ وہ

اُسے آواز بھی دے نہ سکا۔ کھمبے کے پاس کھڑے ایک نوجوان سے چمٹ گئی اور مسکرادی۔ جیسے وہ اس کا منتظر تھا۔

وہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ ڈال کر ایسی بے شان بے نیازی سے باتیں کرنے لگی کہ برسوں کی جان پہچان نظر انداز کر گئی۔ چونکہ یہ نظارہ دیکھتے ہی اسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور دماغ پر جیسے بجلی سی گری......

آصف اس کی حرکات وسکنات استعجاب سے دیکھتا رہا۔ یہ سب دیکھنا اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ پھر جونہی آصف آگے بڑھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ فوراً بجلی کی سرعت سے رینگتی ہوئی ٹرین میں سوار ہوگئی اور آصف دُور سے ہی سحر زدہ سا اُسے دیکھتا رہ گیا۔

اتنے میں ایک نامعلوم شخص نے آکر آصف کو اس طرح چونکا دیا کہ وہ ٹھیک سے نہ کچھ سن پایا اور نہ کچھ بول سکا۔ اتنی جلدی میں ہاتھ میں ایک لفافہ تھما گیا۔ قبل اس کے کہ آصف خط کے متعلق کچھ پوچھتا کان دبا کر وہ بھاگ گیا......خط کھول کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا۔

جو آدمی محبوبہ کی خاطر اپنے چھوٹے بہنوں بھائیوں کی تعلیم اور شادی کی ذمہ داریوں کو فراموش کر کے فرار ہونے پر تیار ہو گیا ہو وہ کسی کی یا اپنے قوم وملک کی خدمت بھلا کیا کر سکتا ہے؟

میں آج کی پیڑھی کو یہی مشورہ دیتی ہوں کہ وہ جوانی کے نشے میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے ماں باپ کی گردنیں جھک جائیں اور ہنستے مسکراتے گھر بکھر جائیں کیونکہ یہ وقتی جنون دائمی نہیں ایک بلبلے کی طرح ہوتا ہے جو سطح آب پر زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتا۔ ہو سکے تو اس بات کو دوسروں تک پہنچانے میں میرا ہاتھ بٹانے میں مدد کریں۔

تمہارے لئے یہ بات بھی بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں N.G.O کی ایک رکن بھی ہوں میں نے تمہیں سگریٹ اور دوسری نشہ آور چیزیں پینے کی عادت دیکھا تھا تو وہ مجھ سے گوارا نہ ہو سکا اور میں نے اُسی وقت فیصلہ لے لیا کہ یہ بُری عادتیں چھڑائیں بغیر نہ رہوں اور تم سے محبت کا ناٹک کھیلوں۔ شکر ہے کہ میں تمہیں اس بری عادت سے چھڑانے میں

کامیاب رہی۔ تو محبت کی پتنگیں اڑانا کس کام کی ہے۔

چونکہ یہاں سے اب میرا تبادلہ ہوگیا ہے۔ لٰہذا آئندہ ملنے کی حماقت اور توقع نہ کرنا۔

خیر اندیش

نرگس

خط آصف کے ہاتھ میں لرز رہا تھا جسے وہ سنبھال نہیں پا رہا تھا جو اُسے ایک وزنی پتھر سے کم نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ وقت سے پہلے بوڑھا ہوکر اب اسکے بوجھ تلے لڑکھڑانے لگا ہو۔

ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا اور بھاری من کے ساتھ پلیٹ فارم سے باہر نکل آنے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ دور سے اپنی چھوٹی بہن کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک اپ۔ٹو۔ڈیٹ نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آتی دکھائی دی۔ وہ دونوں اسی کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہے تھے جس میں تھوڑی دیر پہلے نرگس اپنے جوان ساتھی کے ساتھ داخل ہو چکی تھی۔

آصف اُسے دیکھ کر چونک پڑا اُس کے چہر پر ہوائیں اُڑنے لگی اور اس کا خون کھول اٹھا۔ غصے کی عالم میں وہ ان دونوں کو دبوچ لینا چاہتا تھا۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھ کر اُن کے قریب پہنچ گیا۔ دفعتاً ٹرین آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی نکلی تو اُس کی سماعت سے بہن کی آواز ٹکرائی۔ وہ گھبراتے ہوئے انداز میں اپنے بائی فرینڈ کو کہہ رہی تھی۔

''پہلے ہی تم نے آنے میں دیر کردی چلو اب جلدی کرو۔ ٹرین نکل گئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھیا گھر پر میرا خط پڑھ کر ہم سے پہلے ہی یہاں آجائے تو پھر دونوں کی شامت آجائے گی''۔

یہ سنتے ہی آصف جہاں کھڑا تھا وہیں بُت بنا رینگتی ہوئی ٹرین کو دیکھتا رہ گیا۔ اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے دھوئیں کا ایک ہیولا سا اٹھتا ہوا نظر آیا اور دیر تک کانوں میں پہیوں کا گڑگڑاہٹ کا شور سنائی دینے لگا۔

............☆☆☆............

دیر ہے تو بس ان کے آنے کی

میں سمجھا نہیں؟ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ اگر تم بتانا نہیں چاہتی تو میں بھی ضد نہیں کروں گا۔'' پریم چند کے ماتھے پر بیک وقت کئی شکنیں ابھر آئیں تھیں۔

شانتی دیوی پہلے کی طرح چپ نہ رہ سکی۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں کچھ کھوجنے اور کچھ تلاشنے لگی۔ اگلے ہی پل آنسوؤں کی دو بوندیں اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکل کر پلو میں جذب ہوگئیں۔ پریم چند پریشان ہوگیا اور کئی بار اس سے پوچھنے کی کوشش کرتا رہا مگر ناکام رہا۔ ہر بار وہ لیت ولعل سے کام لیتی ہوئی بات کو چھپاتی رہی جیسے اس نے اگل نہ دینے کی قسم کھائی تھی۔ اس نے اندازہ کرلیا کہ ہوسکتا ہے ماں بیٹے کے درمیان کسی مسئلہ پر ٹھن گئی ہو یا اس کی دکھتی رگ چھیڑنے پر بات بگڑ گئی ہو۔ شاید یہ سب کچھ اسی تکرار کا نتیجہ ہے۔

صبح سے ہی شانتی دیوی بہت خوش نظر آرہی تھی۔ بھگوان نے برسوں بعد اس کے من کی مراد پوری کردی تھی۔ ریڈیو ٹی وی پر جو خبر آئی تھی وہ دوسرے دن اخبار میں چھپی۔ اتفاق سے اس نے سن لی تو خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ سچ تو یہ ہے کہ لگ بھگ پندرہ سولہ برس چلچلاتی دھوپ میں تپتے پتھروں کی بستی میں وہ اتنے پاپڑ بیل چکی تھی کہ اس کے کس بل نکل گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک اچھا خاصا خوشحال آشیانہ ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گیا تھا۔ جو اس نے برسوں سے جوڑ کر بنائے رکھا تھا۔ اس عرصہ میں اتنی خواری اٹھانی پڑی کہ کئی بار اس کے قدم ڈگمگائے مگر...... اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ کہتے ہیں نہ......بھگوان کے گھر میں دیر ہے اندھیر

نہیں......یہ تو بھگوان کی مہربانی تھی۔ایک اچھا خاصا موقع حاصل ہوا۔یونہی وہ اسے کیسے ہاتھ سے جانے دیتی۔یہی سوچ کر وہ بھاگی بھاگی بیٹے انیل کمار سے ملنے کے لئے چلی گئی۔وہاں جا کر اسے ہنریمت کا سامنا کرنا پڑا۔کیونکہ انیل کمار نے یہ کہکر اسے دوٹوک جواب دیا کہ اس خبر میں کوئی صداقت نہیں۔ہوسکتا ہے یہ سیاست دانوں کی ایک نئی چال ہو اور پھر یہاں بیٹھ کے بطور ایکسگریشن ریلیف کے علاوہ ایک فلیٹ قیام کے لئے بھی ہے......شانتی دیوی سے کچھ بن نہ پڑا کہ اسے جانے کے لئے راضی کر لیتی۔دکھیاری نامراد لوٹ آئی۔

شانتی دیوی تھکی ہاری جب پریم چند کے سامنے گٹھری کی طرح بیٹھی ہولے ہولے سسکیاں لینے لگی تھی۔

''کیوں کیا ہوا۔؟ کچھ میں بھی تو سنوں''

''اب کیا بتاؤں۔کوئی فائدہ نہیں۔''

''جب کہنے کو کچھ نہیں تو پھر رونے کی کیا بات ہے'' پریم چند نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔''کیا وہ جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔''

سچ بات تو یہ ہے کہ پریم چند سب کچھ جانتے ہوئے انجان بننے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے زندگی کے سرد وگرم ہوا دیکھے تھے۔وہ ہموار و ناہموار راستوں سے بھی گزر چکا تھا لیکن اب بے کار گاڑی کی انجن کی طرح ہو کر رہ گیا تھا۔اپنی دھرم پتنی شانتی دیوی کا منہ ٹکٹکی باندھے اس کی المناک آنکھوں میں حسرت اور غموں کا پھیلا سمندر لہراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے۔اتنے برسوں بعد بھگوان نے گل خان قالین باف (المعروف لسہ خان) کو توفیق دی کہ اس کو ہماری یاد آئی۔کیا معلوم کس حال میں ہوں گے اور اچانک ایک عرصہ بعد دیکھنے کا خیال کیسے آیا؟۔

پریم چند نے بڑی تسلی سے شانتی دیوی کا ہاتھ پکڑ کر ہمدردی سے سہلایا اور پھر پوسٹ کارڈ کو کئی بار چوم کر اس کی طرف بڑھا دیا جو اسے کل شام ڈاکیہ دے گیا تھا۔

"میں اس بات پر نہیں روئی۔ مجھے جیسا غم اپنوں نے دیا ایسا کبھی سوچا نہ تھا"۔

اچانک شانتی دیوی کے لبوں پر خاموشی کی طنابیں یکبارگی ٹوٹ گئیں۔اس کی آواز سے مایوسی اور تھکان جھلک رہی تھی جیسے وہ کسی گہرے تالاب میں ڈوبتی ابھرتی جارہی تھی۔

کچھ دیر پہلے انیل کمار کے فلیٹ سے آکر بہت پریشان نظر آرہی تھی۔شاید نئی بات معلوم ہونے پر دل ہی دل میں پیچ وتاب کھارہی تھی تبھی تو چہرے پر مایوسی کی چھاپ گہری تھی۔

"اب پڑھ بھی لو کیا لکھا ہے؟......" شانتی دیوی نے جھنجھلاتے ہوئے سپاٹ لہجہ میں سنانے کا استفسار کرتے ہوئے خط واپس کردیا۔

تھوڑی دیر کے لئے پریم چند کبھی خط کو تو کبھی شانتی دیوی کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔بے اختیار اس کی آنکھوں میں بے پناہ درد اُمڈ آیا۔یہاں تک کہ گل خان کا مٹھی بھر داڑھی والا چہرہ اس کی آنکھوں میں پوری طرح ابھر آیا۔وہ یوں ہی بڑبڑانے لگا جیسے گل خان سامنے بیٹھ کر باتیں کررہا ہو۔خط میں لکھا تھا:۔

اب ایک عرصہ ہوگیا۔جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔بدقسمتی سے دو دلوں کو دوآب کی مانند ہوئے زمانہ ہوگیا۔تم نے بھی راتوں رات بھاگتے وقت کانوں میں اصل بات کی بھنک نہ پڑنے دی تھی۔خیر جانے دو اس بات کو...... یہاں تمہاری طرح ہم بھی تو آندھی اور طوفان کے سمندر سے ہو کر آئے ہیں۔کم وبیش بے بسی کے گرداب میں اب بھی ہیں۔تم نے جو کچھ وہاں بھگتا۔اس سے زیادہ ہم بھگتے رہے۔سچائی تو یہ ہے کہ تمہارے جاتے ہی یوں لگا تھا گویا وتھ (دریائے جہلم) میں پانی یخ بستہ ہوگیا ہو۔روانی میں ٹھہراؤ آگیا ہو۔

زندگی میں اتار چڑھاؤ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔یہ ایک امتحان تھا جو گزر چکا۔اس سارے امتحان کی آگ سے ہم سب تپ کر کندن بن چکے ہیں۔اس امتحان نے ہم سبھوں کو بے پناہ پیار ومحبت کا احساس دلایا ہے۔بھئی! کوئی بھی گرداب دائمی کبھی نہیں ہوتا رہتا۔اب تو حالات رخ بدلنے لگے ہیں اور وتھ (دریائے جہلم) کی یخ بستہ سفید پانی بھی

پگھل چکی ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے ہر موکھ کی اونچی اونچی برف پوش چوٹیوں کی برف پگھل پگھل کر بہاروں کی آمد کا پیغام دینے لگی ہے۔ بڑا ہی خوشگوار منظر ہے۔ تم سبھوں کی کمی کا احساس بدن سے نکلی ہوئی روح کی طرح محسوس ہوتا ہے اور پھر جب حق بہانہ می جوابدہ ہوتو پھر دیری کس بات کی۔ جلدی چلے آؤ نا۔ نوری کو شانتی بہن کی بہت یاد ستا رہی ہے۔ انیل بیٹا کیسا ہے؟۔ ایک بار اس کا منہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

تمہارا خیر خواہ......گل خان (المروف لسہ خان)

نوری کا نام سنتے ہی شانتی دیوی کے دل پر کٹاری سی لگی اور برسوں سے قابو میں رکھا ہوا صبر و ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا۔ کسی کٹی ہوئی شاخ کی طرح پریم چند کے سینے سے آ لگی روتی رہی۔ ہذیانی سی کیفیت اس پر طاری ہوگئی تھی ....

''نوری......او نوری۔ یہ تو میری سگی بہن نہیں لیکن ماتا پاروتی کی قسم! میں تجھے کانتی بہن سے زیادہ عزیز سمجھتی ہوں۔ کتنی کٹھور ہو۔ ایک بار بھی میرا خیال نہ کیا اور نہ مجھے دیکھنے آئی......کیسی بہن ہو تم......اس عرصہ میں کیا کوئی پیغام بھجوا نہیں سکتی تھی۔ یہ نہ دیکھا کہ کتنی اذیت ناک تنگدستی اور بے بسی کے عالم میں گھٹ گھٹ کر سانس لیتی ہوئی زندہ ہوں......

دیر تک روتے روتے اور ہچکیاں لیتے لیتے شانتی دیوی کا بُرا حال ہوگیا تھا اور اس کے چہرے پر دکھ و کرب کی پرتیں جمتی چلی گئی تھیں۔ پریم چند نے اس کا بُرا حال دیکھا تو ڈھارس بندھائی۔ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے سمجھانے لگا۔

''بھئی اب تو ذرا خاموش بھی ہو جاؤ۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے صبر کرو......وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ بس ایک معمولی سی غلطی سے بچھڑ کے رہ گئے ہیں۔''

''سنا ہے ایک معمولی سی غلطی پر آدم علیہ اسلام اور حوا علیہ اسلام جنت سے نکالے گئے تھے۔ لیکن ہم لوگوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔'' شانتی دیوی کو کہنے میں تکلیف محسوس ہونے لگی تھی۔

''ہر انسان کو اپنے اعمال و افعال کا پھل ملتا ہے۔ کیا تم اتنی جلدی بھول گئی ہو۔

کسی کے بہکاوے میں آ کر ہمارے قدم بہک گئے تھے۔ایک پاپ کیا ہے کہ بھگوان نے اس کی سخت سزا دی ہے......" ایک سرد آہ بھر کر خود ہی پریم چند نے اپنی داستانِ غم سنائی۔اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔دماغ میں سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔جسم ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ بتدریج نڈھال ہوتا رہا۔سوچتا رہا۔اس سے زیادہ تکلیف دہ موت بھی نہ ہوگی۔اس کے لئے زندگی کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پل موت جیسا ہو گیا تھا۔ اسی حال میں پندرہ سولہ برس گزر چکے تھے۔

شانتی دیوی ایک لمحہ خاموش رہ کر جیسے سکتے میں آ گئی۔پریم چند کے چہرے کو گھورتی رہی۔اس کا جی چاہتا کہ وہ زور سے چیخ پڑے مگر چیخ نہ سکی۔فقط ہائے ہائے کرتی آنسو بہاتی رہی اور روہانسی لہجہ میں بولی۔

"ایشور سب کچھ جانتا ہے۔جس گھر میں جوان بیٹے کی ارتھی اٹھے اس گھر کے غم کی شدت کا درد وہی لوگ جانیں۔ستم بالائے ستم یہ کہ جو جوان بیٹا باپ کو کندھا دینے کے لئے جینا چاہتا تھا وہ باپ کے کندھوں پر راہ عدم کو سدھار گیا۔گل خان کی کمر ٹوٹ چکی ہوگی۔خون کے آنسو پیتے پیتے نوری جانے کیسے جی رہی ہوگی۔"

اتنا کہتے ہوئے شانتی دیوی دیر تک خلاء میں دیکھتی نہ جانے کہاں کھو گئی۔پلکیں نم تھیں۔سوچنے لگی۔یہی کوئی چوبیس پچیس برس پہلے جب شانتی دیوی کے پیٹ میں انیل کمار پل رہا تھا۔نوری واحد وہ عورت تھی جو اپنا گھر چھوڑ کر زچگی کی حالت میں اس کی نگہداشت کرتی رہی۔مسلسل چھ سات راتیں جاگتی رہی۔ایک پل بھی نہ سوئی تھی۔میکے میں ماں باپ کی رفاقت سے کب کی محروم ہو چکی تھی۔بھائی بہن دور دراز گاؤں میں آباد تھے اور ان کو آگاہ کرنے کے لئے کوئی وسیلہ نہ تھا۔گویا نہ آگے نہ پیچھے کوئی ہمدرد یا غمگسار...... اس کا بوجھ اٹھانے والا کوئی موجود نہ تھا۔گل خان تین چار کلیومیٹر پیدل دو وقت کھانا لے کر آتا تھا۔مانا کہ پریم چند اتنا احسان فراموش اور خود غرض بھی نہ تھا کہ وہ نوری اور گل خان کی ہمدردی اور خلوص کو یوں فراموش کر دیتا۔اس نے اسے دور کے کسی رشتہ دار سے کارخانے

کے لئے بینک سے قرضہ منظور کروایا تھا۔ جس سے اس کی حالت کافی سدھر چکی تھی۔

کچھ دیر شانتی دیوی بے آب و گیاہ وادی میں یونہی بھٹکتی رہی۔ اس کے اندر جذبات کا ایک تلاطم سا اٹھتا رہا۔ ایک آندھی سی تھی جو اس کے دماغ میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی لہروں کے مانند اچھل رہی تھی۔ دیر تک پریم چند اسے دیکھتا رہا اور پھر پوچھنے لگا۔

''کہاں کھو گئی؟ لگتا ہے کہ تم اپنے وطن کی پوتر سوندھی مٹی کی خوشبو کی ہو کر رہ گئی ہو۔'' پریم چند کو دیر تک بیٹھے بیٹھے زبرون کے دامن میں بے شمار پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندوں کی کسمساہٹوں کا گمان ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شانتی دیوی کے سر پر اپنا شفقت سے بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

''شانتی! مجھے آج کل اپنا گھر بہت یاد آ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ماتا سرسوتی میرا انتظار کر رہی ہے۔ شاید وہ میری راہ دیکھتی رہتی ہوگی۔ میں کیسے ان لوگوں کو بھول جاؤں جو میرا خیال رکھا کرتے تھے۔ جن کے درمیان پروان چڑھتا جوان ہو گیا۔ جنہوں نے مجھے بے انتہا پیار دیا۔ تو کیا میں ان کی خیر سگالی اور بھائی چارہ کو بھول کر اس بڑھاپے میں الگ ہو جاؤں...... ایک دن باپو نے کہا تھا کہ مجھے کشمیر میں کوئی روشنی کی کرن نظر آ رہی ہے'' ...... میں اپنی برادری سے مل کر ہی رہوں گا اور انہیں منانے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے ان کے دل پگھل جائیں اور اپنے وطن جانے پر تیار ہو جائیں۔''

پریم چند جانے کے لئے تیار نظر آ رہا تھا اور اپنے کئے پر نادم تھا۔ ایک عرصہ پہلے وہ چڑیا کے بچے کی طرح پنکھ نکلتے ہی اپنے گھونسلہ سے ماں کو تنہا چھوڑ کر اڑا تھا پھر جب اچانک وطن کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے احساس سے طبیعت کچھ بشاش ہوئی تو اس کے چہرے پر ایک لازوال خوشی پھیل گئی۔

شانتی دیوی ملن کی یہ طلب دیکھ کر حیران رہ گئی۔ فوراً معاملے کی نزاکت کو بھانپ گئی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ پریم چند کو جاتے دیکھ کر ایک ایک کر کے کچھ نام گنوا دیئے۔

کیدار ناتھ۔ پشکر ناتھ۔ رام لعل۔ کہنیا لعل۔ روپا دیوی اور شانتا کماری۔......
وغیرہ کتنے خوش ہوں گے۔ جب گل خان کا خط دیکھیں گے اور پڑھیں گے۔ انہیں اپنے
وطن کے مٹی کی سوندھی سوندھی مہک سونگھنے کو ملے گی۔ ایک لمبی مدت سے ان کے دل میں
مچلتی رہی ترستی رہی اور تڑپتی رہی۔ ایشور کی کرپا سے پریم چند نے ان کی مراد پوری کر لینے
میں مدد کی۔ راستے میں چلتے چلتے پریم چند کو یاد آ رہا تھا۔

اس کا اپنا اچھا خاصا خوشحال گھر تھا۔ ایک بڑے مکان میں رہتے تھے جو باپ دادا
کے ورثہ سے حصہ میں آیا تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑا کشادہ آنگن تھا۔ ایک حصہ میں چھوٹا
سا باغیچہ بنوایا گیا تھا۔ جس پر ہر صبح آفتاب کی ارغوانی کرنیں پڑی رہتیں تو نرگس۔ گل لالہ،
عشق پیچان، سوسن اور صنوبر کی نرم و معصوم چہکتی مہکتی کلیاں پھوٹنے لگتیں۔ شہد کی مکھیاں
پھولوں کی پتیوں پر شبنم کے قطروں کو چوم لیتیں۔ جنگلی کبوتروں کا اڑتا ہوا غول سرسبز گھاس
جیسے قالین پر غڑغوں کرتا مشغول نظر آتا اور اس بوڑھے درخت چنار کی ٹہنیوں پر چڑے
چڑیا، فاختہ، کوئل اور بلبل چہچہانے لگتے۔ چار سو بھانت بھانت کی بولیاں سنائی پڑتیں۔
ایک وجدانی سماں سا بندھا رہتا...... پھر اچانک ایک ایسی آندھی آئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر
شے تہس نہس ہو کر رہ گئی۔ کلیاں اجڑ گئیں۔ پھول اور پتیاں بکھر گئیں۔ شاخیں ٹوٹ گئیں اور
گم صم ننگے شجر پر پرندوں کی چہچہاہٹ بے معنی ہو کر رہ گئیں جیسے کسی آسیب نے ان دیکھی
آہٹ کی مانند سنسنی برپا کر دی ہو۔ ہر سو موت کا سایہ منڈلاتا رہا۔ حالات کو دیکھتے ہی پریم
چند نے بھی ہجرت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے اپنی زندگی تلخ اور زہر آلود محسوس کر لی تھی۔

رات کا پچھلا پہر اور ابھی سویرا ہونے میں تھوڑا سا وقت باقی تھا۔ مقامی بس اڈہ
میں لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ افراتفری کے عالم میں ان کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ
سب ڈرے ڈرے گھبرائے سے ہوئے لگ رہے تھے۔ کسی سے حال چال پوچھنے یا بتانے
کی فرصت نہ تھی اور ہر کس و ناکس کو اپنی فکر ستائے جا رہی تھی۔ سامنے کھڑی بسوں کے در پر
دھکم پیل اور اچکنے کا ایک جیسا عمل دکھائی دے رہا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹہ پہلے پریم چند اپنی بیوی شانتی دیوی اور بچوں کو لے کر آ گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سب سیٹیں بُک ہو چکی ہیں۔ کوئی ایک بھی سیٹ خالی نہ تھی۔ اس کا اثاثہ جو صرف ایک صندوق، چھوٹی چھوٹی دو اٹیچیوں اور دو کمبلوں پر مشتمل تھا۔ اُمیدوں پر پانی پھیر گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب تھوڑا سا رش کم ہوتا ہوا دکھائی دیا تو اُن سے راستہ بنا کر عاجزانہ لہجہ میں بولا۔

''بابو جی تین ٹکٹیں چاہئیں۔''

''فی الحال کوئی سیٹ خالی نہیں، سبھی بُک ہو چکی ہیں۔''

ٹکٹ بابو کی یہ حوصلہ شکنی باتیں سن کر پریم چند اور بھی گھبرا گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کی بات پر اطمینان نہ ہوا۔ الٹے پاؤں ہانپتے گھبراتے ہوئے ایک ایک بس کا چکر لگایا۔ پلٹ کر واپس آیا اور ٹکٹ بابو کو دوبارہ پکڑا۔ کافی منت سماجت کی۔ جب دال گلتی ہوئی محسوس نہ ہوئی تو اپنی جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ تب جا کر بڑی مشکل سے اس نے حامی بھر لی۔

پریم چند نے اطمینان کی سانس لی۔ ماتھے سے پسینہ پونچھا اور واپس آ گیا۔ دور سے دیکھتے ہی شانتی دیوی سے رہا نہ گیا اور بے صبری سے بچوں کی طرح پوچھ بیٹھی...... ''کیا ہوا؟ سیٹ مل گئی''؟

خوامخواہ تم گھبرا رہی تھی۔ پریم چند نے اقرار میں سر ہلا کر کہا۔ ''سیٹ مل جائے گی۔ ٹکٹ بابو نے اطمینان دلا کر کہا کہ دوسری گاڑی کو آنے دو تو پہلے نمبر پر ہمارے لئے تین سیٹیں بُک کرائے گا۔ اب فکر نہ کرو۔''

''شکر ہے بھگوان کا۔''

البتہ تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ پریم چند اس کے ساتھ باتیں کرنے میں محو تھا مگر اس کی نگاہیں نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھیں...... اتفاق سے ایک خالی سیٹوں والی

گاڑی بس اڈہ میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی ہلچل مچ گئی۔ ایک شور بلند ہوا۔ گاڑی ابھی پوری رُکی نہ تھی کہ سبھی سواریاں اس کی طرف دوڑنے لگیں۔

پریم چند بھاگا، گھبراہٹ کے عالم میں اپنا بوریہ بستر سنبھال کر آندھی کی طرح آگے بڑھا۔ پیچھے پیچھے شانتی دیوی دونوں بچوں کو ساتھ لئے سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتی رہی۔ بڑی تگ ودو کے بعد تین سیٹیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مسافر سیٹوں پر براجمان ہوگئے تھے۔ پریم چند دل ہی دل میں خوش تھا جبکہ شانتی دیوی چپ چاپ شیشوں سے پار دیکھے جارہی تھی اس کے چہرے پر وطن سے دور جانے پر پژمردگی چھا گئی۔ وہ دل میں اندر ہی اندر بھائیں بھائیں کرکے روئے جارہی تھی۔ جیسے آنکھوں سے ڈل اور ولر کا پانی آنسوؤں کی دھار بن کر بہے جارہا ہو۔ گاڑی کچھوے کی مانند اڈہ سے دور ہوتی جارہی تھی۔

اس روز رات کو بستر پر پریم چند لیٹا ہوا بار بار کروٹیں بدلتا رہا۔ جیسے اسے کانٹے دار بچھونے پر سلا دیا گیا ہو۔ شانتی دیوی نے اس کی بے چینی دیکھی تو تھوڑی دیر کے لیے ساکن وجامد ہوکر رہ گئی۔ دوسرے دن بیٹے انیل کمار سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسے مل کر دوٹوک جواب ملا۔

"خبر میں کوئی صداقت نہیں، یہ تو سیاست دانوں کی ایک نئی چال ہوسکتی ہے اور پھر مجھے اپنے وطن جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں آکر نہ کسی بندوق، گولی، گرنیڈ، بم کے دھماکے کا خوف رہا ہے اور نہ ذریعہ معاش کی فکر ہے۔ اچھی خاصی نوکری اور معقول تنخواہ بھی ہے۔ سر چھپانے کے لیے سرکاری فلیٹ کے علاوہ ماہانہ چار ہزار ایکس گریشن ریلیف ملتی ہے۔ تم لوگ اگر جانا چاہتے ہو۔ خوشی خوشی جاسکتے ہو۔"

یہ سنتے ہی شانتی دیوی وہاں سے بے نیل مرام لوٹ کر آئی۔ تکئے کی پشت پر سر ٹکاتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی باڑھ اتر آئی۔

اگلے دن پریم چند اپنا سارا سامان سمیٹ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ شانتی دیوی کا

ہاتھ پکڑ کر جو اس کے بڑھاپے کا سہارا تھی اور جس نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا تھا۔ باہر خیمہ کے پاس کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ شاید منتظر تھا کہ کوئی اور ساتھی مل جائے تو ایک دوسرے کا سہارا بن کر اپنے وطن کا ٹکٹ کٹوادیں۔

وہ جس حال میں آیا تھا۔ اسی حال میں اپنے شہر جانا چاہتا تھا۔ اسی پرانے مکان میں، انہی مکینوں میں، پرندوں کی دنیا میں اور اپنے سے الگ فرقے کے بھائی بہن اور بچپن نانی کے سایہ عاطفت میں جہاں ''اکہ ننذن، ہی مال ناگرایئے'' لل دید اور شیخ العام کے واکھ سنتے سنتے پروان چڑھا۔

آج جب وہ یہ سب سوچنے لگا تو اس کا سارا ماضی روشن ہو گیا جیسے کل ہی کی بات ہو۔ وہ ان سب حقائق کو کیسے جھٹلا سکتا تھا......

ابھی شہر میں اس جیسے پریشان لوگوں کی فریاد سننے والے بہت موجود ہیں۔ ان کے آنسو پونچھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں......

......دیر ہے تو بس ان کے آنے کی......!!!

............☆☆☆............

گُل کہاں، بہار کہاں، آشیاں کہاں

ابھی سورج غروب ہونے کو ہی تھا کہ شام کا سرمئی آنچل ہر شے کو اپنی مہیب تاریکی میں چھپانے کے لئے بیقرار ہوا۔ اسی اثنا میں جموں سے آنے والی ایک ویڈیو کوچ بس کچھوے کی رفتار سے چلتی ٹورسٹ سنٹر کے احاطے میں داخل ہوئی اور اندرونی اڈے کے بیچ گزر کر ایک خالی گوشے میں جا رکی۔ بس کے رکتے ہی شمبھو ناتھ ہڑبڑا کر نیند سے جاگا۔ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے شیشوں سے باہر طائرانہ نگاہیں دوڑائیں۔ اس کی نگاہیں سب سے پہلے اس ریسپشن بورڈ Reception Board پر جم گئیں۔ جس پر جلی حروف میں ''خوش آمدید'' کے نیچے ''سرینگر'' لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر مارے خوشی کے اسکا دل نہ صرف اچھل گیا بلکہ ایک عجیب سی طمانیت کا بھی احساس ہونے لگا۔

چند ساعتوں تک وہ اپنی سیٹ کی نشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے کچھ سوچتے ہوئے اپنے آپ کو یہ یقین دلاتا رہا کہ ایک لمبی جدائی کے بعد اُسے ماں کی گود میں سر چھپانے کا دوبارہ موقع مل گیا ہے۔ نامساعد حالات میں اپنا آبائی وطن چھوڑ کر جاتے وقت اُس نے سوچا نہ تھا کہ اس طرح چلے جانے سے پرائے شہر میں قدم قدم پر اتنی کٹھنائیوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حالانکہ اس کے بھائی بند دوسرے شہروں میں جا کر یوں آباد ہو گئے تھے گویا برسوں سے وہیں کے مکین ہوں۔

شمبھو ناتھ نے ہجرت کیا کی کہ دن کا چین وسکون اور راتوں کی نیند حرام ہو کر رہ گئی تھی۔ مانا کہ اس کی دنیا لٹ چکی تھی اور گھر بھی اجڑ گیا تھا۔ پر حالات تھے بھی ایسے کہ وہ

یہاں سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا اور نئے شہر میں جا کر کھلے آسمان تلے رات بسر کرنی پڑی تھی۔ جھلستی دھوپ کی تمازت میں روزی کے لئے ٹھوکریں کھانا پڑا تھا۔ جس سے پریشانیوں کی ایک کھٹک اس کے جگر میں پھانسی بن کر رہ گئی تھی۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا رہا......!

دیکھتے ہی دیکھتے بیس سال کا عرصہ گذر گیا۔ بیس سال ایک لمبی مدت ہوتی ہے۔ ان بیس سالوں میں شمبھو ناتھ کو ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے وقت تھم سا گیا ہے یا وقت سے پہلے وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ حقیقت میں یہ کسے معلوم تھا کہ وطن کی جدائی نے اُسے مار ڈالا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ جدائی دھوئیں کی سی کڑواہٹ کی طرح اس کے سینے میں سرائیت کر گئی تھی۔ وہ ہر دم تیزاب کی جلن اور زہر کی سی تلخی محسوس کرتا رہتا۔ اُسے زندگی سے مایوس اور دل ملول رہتے سارا جہاں محض ایک تاریک کنوئیں کے سوا کچھ نہ لگ رہا تھا۔ شاید اس سبب سے غم دوران نے اس کے فکر و ادراک پر کچھ ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ اپنے وطن میں ہی مرنے کی تمنا کر بیٹھا تھا۔ ایک عرصہ سے اس کے سننے میں آیا کہ اب وادی کے ناسازگار حالات میں بتدریج کافی تبدیلی آگئی ہے۔ جسے دیکھتے ہی کئی پنڈت گھرانوں نے لوٹ کر یہاں اب دوبارہ بود باش اختیار کرنے میں اپنی دلچسپی ظاہر کی اور کئی ابھی تک اپنے پر تولنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

چونکہ شمبھو ناتھ کے دل و ذہن اور روح کو پہلے سے ہی محرومیت اور اجنبیت کا احساس ناگ بن کر ڈستا جا رہا تھا۔ اس لیئے اس کی سوئی ہوئی اُمنگیں جاگ اٹھیں۔ جس نے اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا کر دی۔ اُسے ہر سُو سے وطن کی سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جتنی ہم آغوشی کی طلب اور چاہت بڑھنے لگی۔ اتنی ہی بے قراری سے اس نے زمین و آسمان کے قلابے ملانے کے لئے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں اور اپنے مقصد میں کامیابی پاتے ہی آبائی وطن جانے کے لئے تمام تیاری مکمل کر لیں۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ چندھیائی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہی کچھ دیر تک مبہوت ہو کر رہ گیا۔

اُسے سامنے کا منظر کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دینے لگا۔ برسوں پرانی اور تاریخی عمارت کا کہیں نام ونشان نہ تھا اور نہ ہی ان چبوتر نما لمبی لمبی قطاروں کی چھتیں دکھائی دیتی تھیں جن پر عشق پیچان کی بیلیں اور گل صنوبر کے پھول کھلے نظر آیا کرتے تھے کہ جسے دیکھنے والے بس دیکھتے ہی رہ جاتے۔اب اس جگہ پر نئی وضع کے طرز کا ایک جدید عالیشان ہوٹل بنوایا گیا تھا۔جس کے سامنے ایک وسیع عریض احاطے پر پھیلا ہوا بس اڈہ تھا......

وہ چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔اچانک اُسے یاد آیا کہ آس پاس گمشدہ چیزوں کے دھندلے دھندلے نشانات میں سے اب صرف بس اڈہ کے مغربی گوشے میں بوڑھا چنار کا درخت سراپا کھڑا اونگھتا ہوا رہ گیا ہے۔ کسی زمانے میں اس بوڑھے چنار درخت کے نیچے ایک معمر شخص الصمد نامی گل فروش اپنی ریڑی پر قسم قسم کے پھول سیلانیوں کو بیچا کرتا تھا۔ جہاں ہر روز گلاب، سوسن، صنوبر، گل لالہ اور گل نبفشہ وغیرہ کی پنکھڑیوں سے لدی بھری ٹوکریاں سجی ہوا کرتی تھیں۔ دُور سے دیکھنے سے ایسا گمان ہوتا تھا جیسے اس جگہ کو کسی مہاراجے کی شب باشی منانے کے لئے رنگ برنگ پھولوں کے مالاؤں سے سجایا گیا ہو۔یا کسی امیر زادی کی کوئی پالکی سیر وتفریح کے لئے آراستہ کی گئی ہو۔لیکن اس جگہ پر اب نہ عبد الصمد اور نہ ہی اسکی ریڑی نظر آرہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں درد کی ایک ٹھیس سی اٹھی۔ اُسے غصہ آنے لگا اور کچھ دیر کے لئے نفرت اور نا گواری کے تاثرات سے چہرے کی رنگت میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوگئی۔

اُسے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا اور اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر شہر شہر گاؤں گاؤں سیر وسیاٹے کے لئے جایا کرتا تھا۔شاید اس سبب سے اس کے ذہن میں قدرتی مناظر کی تصویریں منقش ومحفوظ ہوکر ہمیشہ گھومتی رہتی تھیں۔

نہ جانے کیسے اس کے اندر سارے جہاں کا دکھ وکرب سمیٹ کر آیا۔اس کا جی چاہا کہ تھوڑی دیر کے لئے بیٹھے بیٹھے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھائے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ شاید اس کے دل میں ابھی بھی نا معلوم خوف بھرا تھا۔ جو بھی تھا۔ آج مدتوں بعد اس کا خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔اسی سوچ اور احساس کے جاگتے ہی اس نے فوراً اپنے ذہن سے اس

خیال کو مار بھگا دیا اور فوراً اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

بس سے نیچے اتر کر اس نے پہلا قدم جونہی اپنی پوتر دھرتی کی چھاتی پر رکھا تو اسکی باچھیں کھل گئیں۔ جوش و جذبے اور خوشی کے ملے جلے اثرات کا اتنا غلبہ ہوا کہ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے سب سے پہلے دھرتی ماں کا آشیرواد حاصل کرنے کی غرض سے تھوڑا سا جھکتے ہوئے پرنام کیا۔ پھر سامنے تارکول سڑک کی دھول پر اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے چھوتے ہی سیدھے سر پر پھیر لیا۔ اس سے قبل کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں ٹپ ٹپ کر گر پڑتے اس نے پوری شدت سے انہیں ضبط کر کے پلکوں کے نیچے آنے نہ دیا۔

شمبھو ناتھ سوچ کے سمندر میں ہچکولے کھا ہی رہا تھا کہ اُسے کنڈیکٹر کی آواز نے چونکا دیا۔

"یہ رہا آپ کا سامان۔!" اس نے یہ کہکر ایک چھوٹا سا بریف کیس شمبھو ناتھ کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے پیڑ پودوں کی ایک چھوٹی سی گھٹری چھوڑ کر بس کی اور چل پڑا۔

"آیئے پنڈت جی!" اس بار آٹو رکشا والے نے آواز دی اور اس کی گھٹری کو پاس کھڑے آٹو میں رکھ دی۔ شمبھو ناتھ کے بیٹھتے ہی آٹو اسٹاٹ ہو کر وہاں سے نکل پڑا۔

شمبھو ناتھ آٹو ڈرائیور کی بارعب شخصیت اور جفاکشی دیکھ کر متاثر ہوا۔ دیکھنے میں وہ ایک اچھا خاصا پڑھا لکھا نوجوان لگ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ ہوسکتا ہے آٹو ڈرائیور اس اسٹینڈ کا کوئی سینئر آدمی ہوگا یا پھر کہ ضابطے کے رُو سے سٹینڈ سے نکلنے کی اس کی باری کی سواری رہی ہوگی۔ تبھی تو ساتھیوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور نہ ہی کوئی پنگا ڈالا۔

"کہاں جانا ہے؟" آٹو والے نے متانت بھرے لہجہ میں پوچھا

"گنپت یار۔!"

"گنپت یار......؟" اس بار آٹو والے نے تعجب سے پوچھا

"ہاں بھئی۔ گنپت یار یہ کول،" شمبھو ناتھ نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے'' آٹو ڈرائیور یہ کہکر خاموش ہوگیا اور گردن موڑ کر کچھ لمحوں تک اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

''لگتا ہے نام سن کر حیران ہوئے ہو؟''

''ہاں۔ کچھ ایسا ہی سمجھو۔ میں سمجھا کہ شیو پورہ سونہ وار تک جانا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد کسی پنڈت بھائی کو وہاں جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔'' پھر کچھ توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''دراصل میں چنکرال محلّہ میں رہتا ہوں اور صبح وشام اس راستہ سے گزرتا رہتا ہوں''

''اگر میں کہوں تم میرے ہمسائیگی میں رہتے ہو اور میں تمہارا پڑوسی بھائی ہوں......تو......؟''

شمبھوناتھ کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بڑی حلیمی سے کہا۔

''یہ کسے معلوم تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وادی میں قیامت صغریٰ جیسی آندھی آجائے گی جو ہر شے کو تہس نہس کر کے لوگوں کی زندگیوں کو لق ودق صحرا کے حوالہ کر دیگی......'' کچھ توقف کے بعد پھر دوبارہ بولا۔

''بُرا نہ مانو۔ ایک بات پوچھوں؟''

''ارے بھئی! خاموش کیوں ہوئے۔ بے خوف ہوکر پوچھو جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو''

''کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ یہاں اب پوری طرح شورش کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ گرنیڈ دھماکوں اور گولیاں چلنے میں فرق آگیا ہے۔''

اچانک شمبھوناتھ کے ایک نئے موضوع نے ایک نیا پراسرار ماحول پیدا کیا۔ یک لخت آٹو رکشے کے اندر موت کی سی خاموشی چھاگئی۔ جیسے وہ دونوں کسی شمشان گھاٹ سے لوٹ کر آگئے ہوں۔

آٹو رکشے والا کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ شاید وہ موزون الفاظ کی تلاش میں اپنا دماغ لڑا رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے ایسا جواب دیا۔ جسے سنتے ہی شمبھوناتھ کا سارا جسم پسینے سے تر ہوگیا۔

''جب حالات بدلتے ہیں۔تب زندگی کے معمولات، سیاسی مزاج اور سوچ و اپروچ بدلنے میں وقت نہیں لگتا۔ مانا کہ شورش میں کمی آگئی ہے اور گرنیڈ دھماکوں اور گولیوں کی گونج بھی تھم گئی ہے۔لیکن ضرورت کے وقت کنواں کھودنے میں کونسی عقلمندی ہے۔کاش! لوگوں کا وشواش اور اعتماد جیتا جاتا۔شاید جمہوریت کا تقاضا بھی یہی ہے۔حق تو یہ ہے کہ آزادی کو کوئی دبا نہیں سکتا اور نہ ہی اسے کوئی چھین سکتا ہے۔''

شمبھوناتھ اس کی بات پر چپ ہوکر سوچتا رہا۔سوچوں میں دُور بہت دُور تک بھٹکے بھٹکے ایک سوکھے پیڑ کے اوپر پرندوں کا غول مُنڈ لاتا ہوا نظر آیا تو اس نے ہمت کر کے کانپتے لرزتے انداز میں پوچھا۔

''کیا تمہارے خیال میں پنڈت برادری سر کھشت ہے؟......

اس بار شمبھوناتھ کی آواز سے دھیماپن اور تھکان سی جھلک رہی تھی۔جیسے اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آرہی ہو۔

''پنڈت جی! میں آپ کا شبھ نام پوچھنا ہی بھول گیا۔جانے دو اس بات کو، جو آپ پوچھنا چاہتے ہو۔بے باک...... یہ تو پوچھا نہیں کہ تمہارے محلّہ میں کتنے پنڈت بھائی رہ رہے ہیں۔ان کے گھروں میں ہر روز دیوالی کے چراغ جل رہے ہیں۔ایک اندازہ کے مطابق گنپت یار علاقہ کے آس پاس یہی کوئی سو ڈیڑھ سو کنبے موجود ہیں۔توقع ہے۔اگلے سال تک ان کے تعداد میں مزید اضافہ ہوگا''

یہ سنتے ہی اُسے لگا کہ جیسے اس کی بات شبنم کے قطروں کی طرح مرجھائے پھول کے مانند دماغ پر بوند بوند کر ٹپک رہی ہو اور کانوں میں شہد گھولتی ہوئی اتر رہی ہو۔اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''کیا تم واقعی سچ بتا رہے ہو۔ہائے بھگوان یہ میں کیا سنتا رہا۔مجھے بتایا گیا کہ پچاس ساٹھ کنبے آباد ہو گئے ہیں اور...... یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔پھر ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے'' بھئی! میرا نام شمبھوناتھ ہے۔پیشے سے لگ بھگ دس سال تک بحیثیت ایک ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول نوہٹہ میں کام کرتا رہا ہوں۔''

''اوہ آپ...... میرے بھولے ناتھ ماسٹر جی۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔''

مکالمہ کو دلچسپ بنانے کے لئے آٹو والے نے ایک زوردار قہقہہ اچھال دیا۔ جسے سن کر شمبھو ناتھ بھی اپنی ہنسی نہ روک پایا۔ وہ بھی کھکھلا کر ہنس پڑا اور دل ہی دل میں اس کی حاضر جوابی پر داد دینے لگا۔

آٹو پولو گراونڈ کے شمالی حصے میں جا ہی رہا تھا۔ جہاں برسوں چنار کے درختوں کی لمبی لمبی کھڑا قطاروں میں ہر مسافر کا سواگت کرنے کے لئے دُور دُور تک اپنی گھنی شاخیں سایہ افگن کئے استادہ تھیں۔ رنگ برنگے خوبصورت پرندے اپنی خوبصورت اور میٹھی آوازوں میں اللہ کی رحمت و عظمت کے گن گا رہے تھے۔ یکایک سرد اور ٹھنڈی ہواؤں کا ایک جھونکا اسکے آدھ جلے جیسے بدن کو چھو کر گزرا۔ چھوتے ہی اُسے لگا جیسے اچانک سارا تپتا بدن زمستان کی پاکیزہ بدن کے گالوں پر لٹا دیا گیا ہو یا بادام اور سیبوں کے شگوفوں اور ڈل کی اچھلتی کودتی مچلتی نرم گداز لہروں کے سنگھاسن پر سوار کر دیا گیا۔ اس کے شریر میں ایک نئی روح حلول کر گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی تازہ جوت جگمگا اٹھی۔ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا جس سے اُسے بڑی فرحت کا احساس ہوا اور چہرہ شاداب ہو گیا۔ اب اس کے دل میں سوز و خلش۔ اضطراب، تڑپ اور بے چینی کا دُور دُور تک نہ کوئی نام و نشان تھا اور نہ ہی کوئی یاسیت تھی۔

تھوڑا آگے چل کر آٹو رکشے نے موڑ کاٹ کر پولو گراونڈ سے لگی سڑک پر دوڑنا شروع کیا۔ راستے میں گزرتے ہوئے وسیع میدان میں کئی کھلاڑی فٹ بال کھیلتے نظر آئے۔ دیکھتے ہی اُسے جوانی کے دن یاد آ گئے۔ جب وہاں شہر کے مشہور اور نامور ٹیموں کے درمیان مقابلہ آرائی شروع ہوا کرتی تو لوگ میچ کا بھرپور نظارہ دیکھ کر خوب مزہ لیا کرتے تھے۔ ان ٹیموں میں خصوصاً ٹرانسپورٹ۔ فوڈ سپلائز، محمڈن اور پولیس اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بناء پر صف اول میں شمار ہوتے تھے۔

چلتے چلتے اچانک آٹو والے نے آٹو کی بریک یوں لگائی کہ شمبھو ناتھ کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دیکھا تو سامنے وومنز کالج کے گیٹ سے سفید وردی میں ملبوس لڑکیوں کا

ایک جھرمٹ بے تحاشہ نکل کر سڑک پر جا رہا ہے۔ جس سے ٹریفک جام ہو کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر تک ان کا آٹو بھی وہیں رکا رہا۔ انہیں دیکھتے ہی شمبھو ناتھ کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی سوچوں میں اتھل پتھل مچ گئی۔ وہ زیر لب بڑبڑا رہا...... ''جوانی! ہائے جوانی!''...... وہ جوانی جواب اس وقت اس کے پاس بالکل نہ تھی۔ اس کے ہاتھوں سے چھن چھلیا کی طرح بھاگ کر اپنے پیچھے نا مٹنے والی یادیں چھوڑ گئی تھی۔ وہ سوچتا رہا کہ ایسی یادوں میں کتنی طراوت کتنی کسک کتنی تڑپ اور کس قدر مٹھاس رچی بسی ہوتی ہے۔

اُسے ان تیرتے بادلوں میں شانتا دیوی کی نیم شربتی آنکھوں میں سے دیکھنا صبح کی طرح سرور انگیز اور شفق نما شگفتہ چہرے سے بار بار بدلیوں کی طرح مسکراتے کالج کے دن یاد آ گئے جب اُس نے اُسے پہلی بار کالج کی سندریوں کے درمیان چلتے ہوئے دیکھا تھا اور من مندر میں بسا کر پوجنے لگا تھا۔ شانتا دیوی بھی تتلی کی طرح اڑتی اڑتی اس کے ہاتھ کو پھول سمجھ کر اس پر بیٹھ گئی تھی اور اپنا سب کچھ دے کر اس کی ہو گئی تھی۔

اچانک آٹو رکشا پرانی ڈیوڑھی کے پاس جھٹکے سے رک گیا۔ شمبھو ناتھ کو چونکنا پڑا۔ چونکتے ہی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے خواب میں بھاری ہتھوڑا اسکے سر پر دے مارا۔ دفعتاً آٹو والے کی آواز اس کے کانوں میں سنائی پڑتے ہی خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

''ماسٹر جی! گنپت یار آ گیا ہے۔ کس سوچ میں پڑے تھے''۔

''شمبھو ناتھ آٹو سے نیچے اتر آیا......

دن کا تھکا ہوا سورج کب کا ڈوب چکا تھا اور اب رات کا ملگجا اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ جس کی وجہ سے اکے دُوکے دکانداروں نے سر شام ہی بجلی کے لیمپ روشن کر دئے تھے۔ ان سے چھن چھن کرتی ہوئی ہلکی روشنی آس پاس در و دیواروں اور سڑک پر پھیل رہی تھی۔

آٹو والے نے گٹھری اٹھا کر پاس والے دکان کے تھڑے پر رکھ دی۔ شمبھو ناتھ نے کرایہ ادا کیا اور سامنے کے مندر کی طرف بڑھا۔ اُس نے اپنا پہلا قدم مندر کی دہلیز پر رکھا ہی تھا کہ کسی نا معلوم شخص نے مندر کے اندر گھنٹی بجانے کے ساتھ ہی سنکھ بھی بجایا...... اتفاق

سے اسی وقت ایک مقامی مسجد شریف کے لاوڈ اسپیکر پر مغرب کی اذان بلند ہوئی۔ گویا اس کی آمد پر قدرت نے خوش آمدید کے اظہار میں بڑائی کا اعلان کیا ہو۔

کچھ دیر تک فضا میں دونوں جانب آوازیں گونجتی رہی اور ایک سنگم ایک وجدانی سی کیفیت پیدا کر کے سارے ماحول کو خوشگوار بناتی رہی جسے دیکھتے ہی شمبھوناتھ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے اپنی ماں سے کئی بار سنا تھا کہ جب وہ اس کی کوکھ سے پیدا ہوا تو اس وقت ایسا ہی سماں بندھا ہوا تھا۔ ایک طرف قریبی مسجد شریف میں اذان اور ایک طرف مندر کی گھنٹیاں بیک وقت بج اٹھیں تھیں۔ دونوں گھروں سے آرہی آوازوں کا آسمان کی وسعتوں میں تحلیل ہونا کسی کرشمہ سے کم نہ تھا۔

شمبھوناتھ آگے بڑھا اور بیچ کمرے میں کھڑے شری کرشن جی کی مورتی کے سامنے سر ٹیک دیا۔ پھر مندر کے پجاری کے پاس جا کر ہاتھ جوڑتے پرنام کیا۔

"کہیں آپ کہنیا لعل کپور کے سوپتر شمبھوناتھ تو نہیں ہو۔؟"...... پجاری اُسے دیکھکر تقریباً چیخ پڑا۔

"جی ہاں پجاری جی! آپ نے صحیح پہچان لیا۔"

"جیتے رہو بیٹے۔ لگتا ہے تم آج ہی آگئے ہو۔"

"جی! ابھی آیا ہوں۔ سوچا پہلے بھگوان کرشن جی کا درشن کرلوں"

"کشل منگل رہو"...... یہ کہہ کر پجاری نے داہنا ہاتھ اوپر لہرا کر دو تین بار بل کھانے کے انداز میں آشیرواد دیا۔

پجاری سے رہائی پاتے ہی اس نے سامنے پڑی گٹھری اٹھائی جسے وہ کمرے میں اندر آنے سے پہلے دروازہ کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ گٹھری کو ایک کونے میں لے جا کر اس کی رسی کھولی اور پھر دو الگ الگ حصوں میں بانٹ دی۔

"یہ حصہ آپ رکھ لیجئے۔ باہر باغیچہ میں اگانے کے کام آئیں گے۔ اعلیٰ قسم کے پیڑ پودے ہیں۔"

شمبھو ناتھ نے گھڑی پجاری کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''دوسرا حصہ کہاں لے جانے کا خیال ہے؟'' بے ساختہ پجاری کے منہ کا دہانہ کھل گیا۔

''اپنے گھر کے آنگن میں اگانے کا ارادہ ہے''

یہ سنتے ہی پجاری چپ رہا جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے یہ بتاؤں یا نہ بتاؤں کہ وہ آنگن اب آنگن نہ رہا ہے۔ محلّہ کے آوارہ بچوں کا کھیل کا میدان بن گیا ہے اور جہاں کتوں نے بھی اپنا مسکن بنالیا ہے۔

مندر سے نکل کر شمبھو ناتھ سیدھے گھر کی اور چل پڑا...... وہ ایک ہاتھ میں چھوٹی سی گھڑی اور دوسرے ہاتھ میں بریف کیس دبائے چلا جا رہا تھا۔ جانے کیا سوچ کر پجاری بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ راستے میں اسے مقامی مسجد شریف کے مولوی صاحب سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد اس نے اپنے آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جس پر مولوی صاحب نے اس کی ڈھارس بندھاتے بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور اسکے گھر تک ساتھ چلنے کو ایک فریضہ سمجھتے ہوئے اس کے قدم سے قدم ملائے دو قدم چل کر وہ رک گئے اور پاس کھڑے ایک بچے کو گھر سے کوئی چیز فوراً لانے کی تاکید کر کے پھر آگے بڑھے۔

راستے میں تینوں باتوں باتوں میں اس قدر مہنمک رہے کہ انہیں راستہ کٹ جانے کا احساس ہی نہ رہا۔ یہاں تک کہ شمبھو ناتھ کا گھر آ گیا۔

شام کے سناٹے نے پوری فضا پر سکتہ کا سا عالم طاری کر رکھا تھا۔ ہر سُو تاریکی اور خاموشی باہوں میں باہیں ڈالے اونگھتی بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

شمبھو ناتھ کو سامنے کا سارا منظر کچھ دھندلا سا دکھائی دیا۔ تو وہ سراپا مجسم حیرت بنا ساکت وجامد ہو کر رہ گیا۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ اس کی حالت اس انسان کی سی ہوگئی جو نہ تو بھاگ سکتا تھا اور نہ ہی وہاں ٹھہر سکتا تھا۔ وہ ایک عجیب سوچ میں گرفتار ہو گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اسے شدت سے ایسا محسوس ہوا جیسے اس

کے خوابوں کا شش محل ٹوٹ کر ملبے کا ڈھیر بن گیا ہو۔ اب نہ وہ گھر رہا تھا اور نہ کوئی چہار دیواری سلامت بچی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو گیا۔

پاس کھڑے مولوی صاحب اور پجاری جی نے اس کی حالت غیر ہوتی دیکھی تو آگے بڑھ کر اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے دلاسہ دینے لگے۔ شمبھو ناتھ ایک نظر سے پجاری کو اور دوسری نظر سے مولوی صاحب کے باریش چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھنے لگا۔ اُسے لگا کہ نامعلوم فاصلہ کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی چلا گیا ہے۔ مایوسی کے عالم میں زیر لب مسکراتے ہوئے وہ مولوی صاحب سے مخاطب ہوا۔

''اب آپ ہی یہ پودوں کی گٹھری اپنے پاس رکھ لیجئے ......'' یہ کہہ کر اس نے مولوی صاحب کے ہاتھ میں گٹھری تھماتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی ......''ممکن ہے مسجد شریف کے صحن پاک میں کسی جگہ اگانے کے کام آئیں۔''

اس کا طنز بھرا تیر مولوی صاحب کے دل میں اُتر گیا۔ ایک نامعلوم سی خلش محسوس کرتے اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

''بیٹے شمبھو ناتھ آج رات تم ہمارے مہمان ہو۔ باقی کل پر چھوڑ دیتے ہیں''

اس کی تائید میں پجاری نے سر ہلاتے ہاں میں ہاں ملا دی۔

اس اثناء میں وہ لڑکا جو کچھ دیر پہلے مولوی صاحب کے کہنے پر گیا تھا دوڑ کے آیا اور مولوی صاحب کے ہاتھ میں کوئی چیز تھما گیا۔ یہ چابیوں کا گچھا تھا جو مولوی صاحب نے جھٹ پجاری کی موجودگی میں شمبھو ناتھ کے حوالے کر دیا۔

''دیکھتے ہیں اللہ بھگوان کی کیا مرضی ہوگی۔ آج تک اس کے سامنے کسی کی چلی ہے۔ بندہ بے وزن تنکے کی مانند ہے۔ بے بس و بے اختیار ہے''

اب مسلہ یہ تھا کہ شمبھو ناتھ کس کے ہاں آج کی رات مہمان بنکر ٹھہرے گا۔ ایک سوالیہ نشان پجاری اور مولوی کے درمیان کھڑا تھا۔ شمبھو ناتھ دونوں کے شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ دائیں جانب ایک اور بائیں جانب دوسرا گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے

کیلنڈر کا چھٹواں صفحہ تھا......! اپنے پیچھے چوبیس زینے طے کر کے اب جون کا مہینہ پچیسویں منزل میں داخل ہو گیا تھا۔ درختوں پر پرندوں نے چور مچانا شروع کر دیا تھا۔ صبح تڑکے سے ہی آسمان کھل کر پوری بستی پر پھیل گیا تھا۔ جدھر نگاہیں دوڑائی جاتیں۔ کھیت کھلیان اور سڑکوں پر چہل پہل و گہما گہمی دکھائی دیتی گویا دوڑتی بھاگتی زندگی اپنے منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے روزی کی تلاش میں نکل چکے تھے۔ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔

دوپہر کا ایک بجا تھا اور سورج سر کے عمود پر کھڑا تھا۔ اچانک بستی میں ایک عجیب سا شور اٹھا۔ شور اتنا ڈراونا تھا کہ پوری بستی میں ہاہا کار، اتھل پتھل اور بھگڈر مچ گئی، لوگ تذبذب کے عالم میں بوکھلا کر رہ گئے۔ غم اور اندوہ کے اندھے کنوئیں میں اوندھے منہ گرتے پڑتے بھاگنے لگے۔ سب ڈرے ڈرے سہمے سہمے نظر آئے اور ان کے چہرے اترے اترے اور آنکھوں میں حیرت تھی۔ پیشانی پر گہری لکیریں اور منہ کھلے کے کھلے۔ زبان گنگ، حال بتانے اور پوچھنے سے قاصر لگ رہے تھے۔ صرف آنکھوں کے اشاروں اور کنایوں سے ہی اپنی کیفیت کا اظہار کر پا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ آواز اتنی بلند ہوتی گئی۔ مکانوں کی کھڑکیوں پر لگے شیشے اور دروازوں کے پٹ ٹوٹنے کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑکیں ویران اور سنسان پڑ گئیں۔ جیسے پوری بستی پر کوئی افتاد نازل ہوئی تھی......شام اتر گئی۔ آہستہ آہستہ چاروں طرف دھندلا دھندلا سا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا،

کوزے میں شاید دریا سمٹ آیا تھا۔ دوسرے دن سورج طلوع ہوا...... وہ جون کا چھبیسواں تھا جو اپنے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ کر بڑا خونخوار ثابت ہو گیا تھا۔ ابھی سورج افق سے کچھ اوپر اٹھ آیا تھا۔ سائیں سائیں کرتی گرم ہواؤں میں تیزی آ گئی تھی۔ آن کی آن میں لوگ اپنی قیام گاہوں سے شہد کی مکھیوں کی طرح باہر نکل آ گئے۔ پل بھر میں بازاروں، گلیوں اور سڑکوں پر عورتوں، بچوں، نوجوانوں کا جم غفیر لگ گیا۔ جلسے وجلوس اور اجتماعی مظاہرے دھیرے دھیرے طوفانی شکل اختیار کر رہے تھے۔ بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جس سے زندگی کا سارا نظام ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا......!

وہ جس مقصد کو لے کر یہاں آیا تھا۔ نامساعد حالات کی بناء پر سارے کرے کرائے پر پانی پھیر گیا تھا اور سارا منصوبہ ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ ایک ہفتہ ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔ ایک ایک کر کے تین دن کمرے میں بیٹھے بیٹھے اب اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وقت زندگی کی مٹھی سے ریت کی صورت میں پھسلتا جا رہا ہے۔

اس دوران اس نے لال چوک میں گھنٹہ گھر کے قریب سر راہ چلتے چلتے کئی لوگوں کی ٹولیاں گزرتی جاتی ہوئی دیکھی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی فوراً پولیس حرکت میں آ گئی۔ اتنی تعداد میں پولیس کہ ہر طرف ان کے سر ہی سر نظر آتے۔ لوگوں کا بچنا محال ہو گیا تھا۔ پہلے ان پر لاٹھیاں برسائی گئیں۔ پھر آنسو آور گیس کے گولے چھوڑے گئے۔ پکڑ دھکڑ میں جو بھی ہاتھ آیا اسے بکتر بند گاڑی میں ٹھونس دیا گیا۔ بھیڑ بکریوں کی طرح جیسے وہ انسان نہ ہوں۔ لوگ نوجوانوں کی گرفتاری کے خلاف مکمل ہڑتال اور اجتماعی مظاہرے کرنے لگے۔ چھوٹے چھوٹے بچے میدان میں اتر آئے نوجوانوں سے شانہ بہ شانہ کندھا سے کندھے ملا کر چھوٹے بڑے پتھر اور کنکر مارتے اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ جیسے انہیں حریف کو مار بھگانے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر پولیس طیش میں آ گئی۔ بے تحاشہ فائرنگ کی آڑ میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ چند ہی لمحوں میں سڑک پر جا بجا انسانی خون کے دھبے اور خون سے لت پت بے گور لاشیں پڑی نظر آنے لگیں۔ گرد و غبار سے اٹی...... پڑی بستی موت کے

شکنجے میں پھنس کر رہ گئی۔۔۔۔

ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔کون مرا؟ کس کا خون گرا......؟ کتنے گھروں کے چراغ بجھ گئے......؟ کیا یہ بستی کبھی آباد بھی تھی......؟ اسے دیکھ کر اس کا وجود ہل گیا اور اس کے اندر جانے کیسی ٹوٹ پھوٹ ہوئی، ذہن میں مسلسل ضربیں لگنے سے سوالوں کی قطاریں کھڑی ہوگئیں۔وہ اس مخمصے سے نکل نہیں پا رہا تھا۔اس کے سامنے گہرا اندھیرا چھا گیا۔

دور سے اس نے سارا خونی منظر دیکھا تھا۔گھبرا اٹھا۔وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا بھاگا ہوٹل میں آ گیا......

سہما سہما تھکا تھکا اسے عجیب سی دہشت نے گھیر رکھا تھا۔کئی دنوں سے اب وہ بستر پر لیٹے لیٹے بوریت محسوس کرتا رہا اور اکتا گیا تھا۔اپنی خفت کو دور بھگانے کے خیال سے اس نے نہرو پارک جانے کا ارادہ کرلیا۔شاید اسے بتایا گیا تھا کہ یہ علاقہ خطرے اور سورش سے باہر ہے۔تھوڑی دیر کے لئے کھلے آسمان کے تلے، نیلی نیلی جیسی جھیل کی پانیوں میں سکون کی ہلکی سی روشنی نظر آئی۔اس کے دماغ میں طوفان اور آندھی کا شور کم ہوا اور یہ سوچ کر وہ باہر کھلی فضا میں چلنے کے لئے تیار ہوگیا۔

دراصل وہ شہر کے ایک مشہور ہوٹل ''زبرون'' میں ٹھہرا ہوا تھا۔جو بلیواڈ سے سات گز کی دوری پر شنکر آچاریہ کے دامن میں آباد ہے۔اس کے بائیں جانب نشیبی حصہ میں امراض سینہ اسپتال کی اونچی اونچی پر شکوہ عمارت کھڑی تھی۔جو موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا مریضوں کو مسیحا کے روپ میں فرحت اور سکون بخشتی ہے۔پائین علاقے میں زیادہ تر امراُ اور وسا اور بیروکریٹ رہائش پذیر ہیں۔یہ علاقہ گرین بیلٹ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔شاید اس بناء پر ہمیشہ یہ علاقہ کرفیو سے مستثنٰی رکھا جاتا۔

نہرو پارک ڈل جھیل پر زمین کے ایک خشک حصے پر ہے جہاں ایک ماڈرن طرز سے بنا ایک شاندار ہوٹل کھڑا ہے۔اس کے کمپاؤنڈ میں ایک تالاب بنوایا گیا ہے۔یہاں ہمیشہ تماشبینوں کا رش لگا رہتا ہے۔تالاب میں ڈبکیاں لگاتے اور پانی کے اندر مچھلی کی طرح

مچلتے تھرکتے تہہ میں اتر جاتے۔ پینڈے میں اٹھنی روپیہ دو دو روپے کے سکے جتنے ہاتھ آجاتے اٹھا کر واپس نکل آتے۔ یہ سکے سیلانی اپنے دل بہلائی اور کھیل دیکھنے کے لئے لئے پھینکتے تھے اور خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے۔

مزمل ان ہی غوطہ خوروں میں سے ایک نوعمر لڑکا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح پاس پڑوس محلّہ میں ایک بوڑھے ضعیف مزدور کا اکلوتا بیٹا...... یہی کوئی اس کی عمر پندرہ سولہ سال کے درمیان ہی ہوگی۔ بڑا پھرتیلا اور چالاک مگر دیکھنے میں کمزور اور لاغر دکھائی دیتا تھا۔ چہرے پر زعفرانی سی زرد رنگت پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں غربت کی المناک داستان مدفن تھی۔ لیکن جب پانی کے اندر تیرنے لگتا تو زمین کی مخلوق کو پانی کی مخلوق بننے میں دیر نہیں لگتی۔ کسی ڈالفن dolphin کی طرح چھلانگیں لگا دیتا تھا اور دیکھنے والوں کو مسحور کر رہا تھا۔

پچھلے دو دنوں سے وہ مزمل کو دیکھتا جا رہا تھا اسے اپنا چھوٹا بیٹا علین یاد آیا جو اس کے دوست کے ہاں سوئمنگ پل Swimming pull میں اسی طرح ڈبکیاں لگا دیتا رہتا...... دم بھر یاد پڑ جانے سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ فوراً ہی اس نے اپنے جذبات قابو کر لیا اور اس خیال کو دور مار گرا دیا۔

وہ اس کی پھرتی سے اتنا متاثر ہوا اور محفوظ رہا کہ اسے اپنے پاس بلا کر طرح طرح کے سوالات پوچھتا رہا۔ ”بیٹا، تمہارا نام کیا ہے؟ کس جماعت میں پڑھتے ہو؟“

”صاحب! میرا نام مزمل ہے پڑھائی نہیں کرتا بلکہ ایک مستری کی دکان پر کام کرتا ہوں...... یہ سن کر اس کے دل کو ایک گہرا دھچکا لگا۔ اس کی یہ عمر پڑھنے لکھنے کی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حکومت کے سب دعوے کیوں کھوکھلے ثابت ہو رہے ہیں۔ جنہوں نے بچہ مزدوری ناجائز قرار دی تھی۔ خدا جانے علین پڑھائی کی طرف توجہ بھی دیتا ہوگا کہ نہیں...... اس خیال نے اسے مزید پریشان کر دیا۔

”کیا تم یہاں روز آتے ہو؟“ اس کا دوسرا سوال تھا۔

”گاہے گاہے۔ البتہ ہڑتالی دنوں میں تھوڑی بہت کمائی ہوتی ہے۔“ مزمل

صاف گوئی سے کام لیتا رہا اور وہ غلو بیانی کو گناہ عظیم سمجھتا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ دن میں کتنا کماتے ہو؟ کیا یہ سب تم اپنے دل بہلائی کے لئے کرتے ہو یا کوئی مجبوری کرا رہی ہے؟''

''نہیں۔ رہی بات دل بہلائی یا مجبوری کی۔ غربت اور مفلسی جو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اٹھارہ انیس روپئے اٹھاتے ہیں۔ اپنا کام نکل جاتا ہے......'' یہ کہتے ہوئے مزمل کے چہرے پر اداسی کی ایک لہر آئی اور گئی، جیسے جھیل کے پانیوں میں موٹر چلانے سے بے شمار لہریں اُٹھتی رہتی ہیں۔

سیلانی جانتا تھا کہ بچوں کی فطرت میں ضد کرنا کھیلنا اور بڑا امیر بننے کی چاہت ہوا کرتی ہے مگر ہر ایک کی خواہش اور مراد پوری نہیں ہوتی......

چند لمحوں تک مزمل اسے گھورتا رہا اور خیالوں کی وادیوں میں بھٹکتا ہوا پا کر اس کی خاموشی برداشت نہ ہو سکی۔ اونچی آواز میں بولا: ''صاحب! میں کوئی مقدر کا سکندر فلم کا امیتابھ بچن نہیں ہوں۔ ایک گھنٹہ میں ہزار ڈیڑھ ہزار کماؤں۔ میرے مقدر میں جتنا لکھا ہے اسی میں خوش ہوں......'' مزمل نے کسی فلم ایکٹر کی طرح ایسا ڈائیلاگ مارا کہ وہ ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

''تمہارے گھر میں کون کون لوگ ہیں؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''گھر میں بوڑھے ماں باپ کے علاوہ میری ایک چھوٹی بہن ہے۔ ہمیشہ مجھ سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے بڑی لڑاکو لڑکی ہے وہ۔''

اس بار وہ دونوں ہنس پڑے۔ جب انہوں نے بیک وقت دور ایک شکارا میں دو چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو آپس میں لڑتے ہوئے دیکھا......شاید وہ چپو چلانے کی ضد میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھائی بہن ہونگے۔ ہمسایہ یا رشتہ دار بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک جیسا قد رکھتے تھے، بڑے خوبصورت تھے......اچانک وہ علین کے متعلق سوچنے لگا جو چاکلیٹ چھپانے پر اپنی بہن آیت سے ضد کرتا اور لڑتا جھگڑتا رہتا۔

''اب آخری سوال ہے۔ لگتا ہے میری باتوں سے بور ہو گئے ہو؟''

''جی نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے آپ اچھے لگتے ہیں اور جو اچھے اچھے سوالات کرتے ہو۔ آج تک کسی سیلانی نے اس طرح کی باتیں نہیں کیں......'' مزمل نے سینہ تان کر اپنی حاضر جوابی کا ثبوت دیا۔

''اچھا بیٹا یہ بتاؤ۔ آج کل شہر میں جو گڑ بڑ اور جلسے جلوس ہو رہے ہیں۔ کبھی لوگ پتھراؤ کرتے ہیں اور کبھی کسی گاڑی کو نذر آتش کر دیتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی پتھر اٹھایا اور کسی کے سر پر دے مارا؟'' ایک لمحہ کے لئے مزمل چونکا۔ پاؤں تلے زمین سرک گئی جیسے کوئی بھاری پتھر خود اس کے سر پر آ لگا تھا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ کہیں یہ سیلانی سیاہ لباس میں پولیس کا آدمی تو نہیں ہے۔ پہلے ادھر ادھر گھمایا اور اب کوئی بات اگلوانے کی کوشش کر رہا ہے...... یہ سوچ کر اس نے اپنا غصہ کڑوی تھوک حلق کے نیچے اتارا اور منہ پھاڑے اس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا...... اسے یاد آ گیا کہ پرسوں ہی وہ ایکس چینج روڈ پر سنگ باری کرتے وقت پولیس کے ہاتھوں سے پکڑ سے فرار ہونے میں بال بال بچ گیا تھا۔ مٹرگشتی کرتے کرتے اپنے دونوں کے بہکاوے میں آ گیا تھا ..... اب وہ وہاں زیادہ دیر تک رکنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ وہاں سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتا تھا جبکہ سیلانی مزمل کے خیال میں اتر کر اس کی بے چینی اور کرب کو سمجھ پا رہا تھا۔ بڑی متانت سے بولا: ''دیکھو بیٹا! میرا یقین جانو۔ میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں اور نہ پولیس یا سی آئی ڈی محکمے سے تعلق رکھتا ہوں یہ جو میں تمہیں اس لئے پوچھ رہا ہوں اس کے پیچھے میرا کوئی مقصد نہیں۔ اس میں تمہارے جیسے لوگوں کی بھلائی ہے۔ جواب دینا نہیں چاہتے ہو، مت دو۔'' سیلانی نے اسے دلاسہ دیا اور قسم کھانے کے انداز میں اپنی شہادت انگلی گلے تک لے آیا۔

چند ساعتوں تک مزمل سوچتا رہا۔ جواب دینے کے پلڑے میں جھولتا رہا اور الجھتا رہا۔ آخر کار تھک کر جذباتی انداز میں گویا ہوا: ''صاحب! یہ پولیس والے بڑے کمینے لوگ ہیں۔ بے وجہ لوگوں کو مارتے اور پیٹتے ہیں۔ گولی کا نشانہ بناتے ہیں اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیتے ہیں۔ بابا کہتے ہیں، ارباب اقتدار نے یہاں کے عوام سے چھ دہائیوں

سے قبل استصواب رائے کا وعدہ کیا تھا۔اس بات سے مکر گئے ہیں۔ہم تو صرف اپنا حق مانگتے ہیں۔انگریزوں نے ہندوستان کو چھوڑ دیا تھا ہم بھی یہاں ہندو مسلم اور سکھ اکٹھے مل کر الگ ریاست مانگتے ہیں لیکن گولی کا نشانہ صرف مسلمان بنایا جاتا ہے......''

یہ کہہ کر مزمل اتنا رویا کہ سیلانی کا دل بھر آیا۔اس نے اسے اپنی چھاتی سے لگایا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا......دفعتاً اسے گجرات میں فرقہ وارانہ فسادات کروانے اور تقویت دینے کی ان شر پسندوں کے اوچھے ہتھکنڈوں کے ایک ایک حالات اور واقعات یاد آگئے۔جب بلوائیوں نے عورتوں کے ساتھ نازیبا حرکتیں کیں۔حاملہ عورتوں کو گھسیٹ دیتے،اپنے ترشول ان کے پیٹ میں گھونپ دیئے۔کئی معمر ناتواں لوگوں کو زندہ جلا دیا......اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو تلواروں اور کلہاڑیوں سے قتل اور گولیوں سے بھون ڈالا......

اس کے سامنے یہ تمام قصے اور واقعات پردہ سیمیں پر جیسے دکھائی دیتے جن حالات سے مالیگاؤں اور گجرات ایک عرصہ پہلے دوچار ہو گیا تھا۔جس کے چپہ چپہ پر کالی دیوی اپنا تسلط جمائے قتل و غارت کی وحشیانہ پرچھائیاں رقص کر رہی ہو۔اسے لگا،توڑ پھوڑ ہلاکتوں پر ہلاکتیں گولیاں برسانے اور تشدد کا نشانہ کشمیری عوام خصوصاً مسلمان پر وہی نسخہ آزمانے کا عمل جاری وساری ہے۔

اچانک سیلانی کا دل پسیج گیا اور اندر ہی اندر رو رہا تھا۔جسے کھل کر وہ مزمل کے سامنے اظہار نہ کر سکا اور نہ اسے اس بات کا احساس ہونے دیا۔دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کو خاموش دیکھتے رہے۔کبھی آسمان کی وسعتوں میں تکتے اور کبھی جھیل کے نیچے پانیوں میں اتر کر سکون دل و قلب تلاشتے رہے۔

سیاح اتنا متاثر ہوا کہ اس کی پلکیں بھیگ گئیں اور ان آنسوؤں کو دیر تک روکے رکھا باہر آنے نہ دیا۔اس نے مزمل کی باتوں میں جتنی نرمی سچائی اور حلاوت پائی اس سے کہیں زیادہ اس کی بے باکی اور جرأت کے لئے داد دی۔اب تک یہاں سے دور کہیں رک رک کے آنسو،آور گولیوں اور بندوق کی گولیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔انہوں نے زیادہ

دیر تک رکنا مناسب نہ سمجھا اور نہ ہی گفتگو کو طویل بنا دیا۔ دونوں نے اپنی گھر کی راہ لی۔

چلتے چلتے ان کے درمیان دوبارہ بات چیت کا سلسلہ چلتا رہا۔ طرح طرح کے سوالات پوچھے اور جواب سنتے سنتے اس نے مزمل کی بے بسی پر ترس کھایا اور اپنے بٹوے میں سے سو کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور یہ کہتے ہوئے بوڑھے باپ کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے دن ہوٹل میں آنے پر زور دے دیا۔

سڑک کے دوراہے پر پہنچ کر سیلانی نزدیکی بک اسٹال کی جانب بڑھا اور مزمل اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سیلانی نے بک سیلر سے ایک تازہ افسانوی مجموعہ ''بند مٹھی سے بھاگا پرندا'' خرید لیا۔ رات گئے تک اسے ناولیں مطالعہ کرنے کا شوق تھا...... کسی نے ان کو بتایا تھا کہ اس مجموعے میں وادی کے پسِ منظر کی دلچسپ کہانیاں شامل ہیں۔

پانچواں دن ناشتے کا وقت تھا۔ اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا تھا۔ ویٹر کمرے میں ناشتہ لے کر آیا۔ صبح صبح وہ ناشتہ کرتے وقت پہلے تازہ اخبار پڑھنے کا عادی تھا۔ اس نے ایک سرسری نظر اخبار پر ڈالی اور چائے کی پیالی ہاتھ میں اٹھائی کہ اچانک اس پر رعشہ طاری ہو گیا۔ پیالی کانپتے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچ گئی۔ دفعتاً اس کی پہلی نظر کسی نو عمر ایک لڑکے کی لاش کی تصویر سے ٹکرائی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہ مایوس ہو گیا اور ایک عجیب الجھن میں اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا جیسے اس کا کوئی اپنا بچھڑ گیا تھا۔ آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ اس کے مقصد کو دھندلا کر رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک عود کر آئی، وقت کا پنچھی محوِ پرواز تھا اور وہ کھڑکی کے پٹ کھول کر دور پرے ڈل جھیل میں ایستادہ ڈونگوں کو تک رہا تھا۔ اچانک آہٹ سن کر اس نے اپنی نظریں ہٹائیں۔ دیکھا دروازے پر کھڑا نا معلوم چہرہ تک رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ بت بنا اس کے سراپے کا جائزہ لیتا رہا۔ اتنے میں ویٹر اسی اجنبی لڑکے کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

''صاحب! مزمل کے ایک دوست کو اپنے ساتھ لایا۔'' یہ کہہ کر ویٹر فوراً الٹے

پاؤں کمرے سے باہر چلا گیا۔

''کیا کام کرتے ہو بیٹا...... مزمل کو جانتے ہو؟'' اس نے اجنبی لڑکے کے ہاتھ لوکل اخبار پکڑا دیا۔

''جی ہاں۔ میں ششم میں پڑھتا ہوں اور یہ تصویر مزمل کی ہے۔ میرا ہمسایگی میں میرا جگری یار ہے۔ کل رات بچارا وہ اپنے بوڑھے باپ کے لئے بازار میں دوا لانے گیا تھا۔ اچانک ایک مشتعل ہجوم میں پھنس کر پولیس کی گولی لگنے سے وہیں شہید ہو گیا۔'' کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں سے دو آنسو ڈھل کر اس کے رخسار پر بہنے لگے۔ وہ سسکنے لگا اور پھر زاروقطار رونے لگا۔

بڑی مشکل سے سیلانی نے اسے چپ کرایا۔ تب وہ مزید پوچھنے کے لئے دم سادھے بیٹھ گیا۔

''پھر تو تم اس کا گھر اور ماں باپ کو جانتے ہونگے؟'' سیلانی نے اس کی خاموشی توڑتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

''بالکل جناب۔''

''پھر میرے ساتھ چلے آؤ......'' نہ جانے کیا سوچ کر سیلانی اپنا بریف کیس اٹھا کر کمرے سے باہر نکلا۔ پیچھے پیچھے نووارد لڑکا اس کے تعاقب میں چلا آیا...... ہوٹل سے باہر نکل کر سیلانی نے ٹیکسی منگوائی۔ راستے میں اس نے اپنے چک بک میں سے دو الگ الگ فارموں پر نام لکھوا دیئے اور ان کے نیچے بالترتیب وہ مخصوص رقم تحریر کی جو اسے کمپنی کی طرف سے یہاں کے ایک تمدنی پروگرام کو منعقد کرانے کے لئے دی گئی تھی۔ ایک پرچی پر مزمل کے باپ کا نام لکھا اور دوسرے چٹ پر سینہ امراض کے سپرنٹنڈنٹ کے نام لکھ کر اسے سپرد ڈاک کر دیا۔ گویا اس طرح اپنے سینے سے بھاری بوجھ اتار دیا ہو۔

ٹورسٹ سینٹر جاتے جاتے اس نے ڈل گیٹ بازار میں لوگوں کا ایک بڑا جلوس گزرتے دیکھا۔ ٹیکسی رکوا کر اس لڑکے کے ہاتھ میں پچاس کا نوٹ تھما کر اترنے کو کہا۔

اسی اثنا میں جلوس ان کے قریب پہنچ گیا۔

جلوس میں شامل کچھ لڑکوں نے جب اسے ٹیکسی سے اترتے دیکھا تو خوشی سے مچل اٹھتے ہی انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

"آ گیا۔ آ گیا۔ شیرا آ گیا......" یہ سن کر وہ پہلے ٹس سے مس نہ ہوا۔ پل بھر خاموش نظروں سے دیکھتا رہا۔ لیکن جب اپنے ساتھ شمولیت کرنے کے لئے اشاروں اور کنایوں سے اصرار بڑھتا ہی گیا اور ایک ایسا لمحہ آیا جب کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ عجیب کشمکش میں تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

......پھر نہ جانے سوچ کر اس نے نوٹ کو مروڑ کر سیلانی کے ہاتھوں میں تھما دیا...... دوسرے لمحے میں ہی برق رفتاری سے دوڑ لگا کر سامنے جلوس میں سب سے آگے شعلہ جگاتا رہا اور زور زور سے فلک شگاف نعرے لگاتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے شریر میں کوئی روح حلول کر گئی ہو۔

سیلانی اس غیر متوقع حالت دیکھ کر ہونقوں کی طرح دیکھتا رہ گیا اور اس کے کانوں میں شیرا کے آخری الفاظ ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ جاتے جاتے شیرا نے کہا: "آزادی کا ایک دن سو برس کی غلامی سے بہتر ہے اور ہم کسی سے اس کی بھیک نہیں مانگتے ہیں۔"

سیلانی نے محسوس کیا جیسے یہ کہتے ہوئے شیرا کی بلوریں آنکھوں میں مزمل اور اس جیسے دوسرے معصوم لڑکوں کے لئے سارے جہاں کا درد و کرب، سارے دکھ اور سارے غم اور آنسو ایک ساتھ امڈ آئے ہوں......اور وہ ان آنسوؤں کے سیلاب میں دور بہت دور بہہ گیا ہو......!!

............☆☆☆............

دہشت گرد کون؟

(ایک افسانے کے دو روپ)

کئی برس کی قید بامشقت کے بعد رہائی کے اچانک تصور کے کیف وانبساط میں جب کوئی سہما سہما خوف زدہ محبوس نوجوان جیل کی کال کوٹھری سے نکلے اور سسکتی ہوئی زندگی محسوس کرلے۔ پھر موندتی ہوئی آنکھوں سے اپنے گردوپیش پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے ایک نامعلوم سی خوشی میں سامنے کا منظر کچھ بدلا بدلا سا دیکھے اور اپنے آپ کو آزاد پر ندہ جان کر نئی زندگی کی تمہید وتجدید کرنے کی فکر میں تپتی دوپہر کی جھلتی تارکول کی سڑک پر جہلم کی روانی کی طرح رفتار پکڑتے ہوئے سوچنا شروع کردے تو پہلا خیال یہ آتا ہوگا کہ زندگی کے جو تھوڑے بہت دن رہ گئے ہیں۔ انہیں کیسے کاٹے۔

ایسا قیدی۔! جس کی خواہشات دبی رہی ہوں۔ جس پر طرح طرح کے عجیب وغریب اذیت ناک ظلم وستم کے حربے آزمائے گئے۔ ابھی ایک جگہ سزا کی مدت پوری بھگتی نہیں کہ دوسری سزا کے لئے دوسری جگہ منتقل کر کے زندگی اجیرن بنادی گئی یا ایک ہی جگہ کسی تنگ کال کوٹھری میں ہی سالوں تک قید رکھ کر معذور ہونے دیا گیا......

......پھر ایک دن کسی مصلحت کے تحت اچانک رہا کر کے باہر کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے حیرت وحسرت میں مبتلا کر کے آزاد چھوڑ دیا جائے۔

......اور وردی پوشوں کی عقابی اور عقابی نظروں سے بچتے بچاتے ان کے مکروہ قہقہوں اور غلیظ گالیوں کی بوچھار سے پیچھا چھڑاتے سماعتوں سے ٹکراتے، طعنوں بھرے

فقروں اور شور سے پسینے میں شرابور دیر تک بھاگتے بھاگتے گویا موم کی طرح پگھلتے ہوئے پانی کی ایک بوند کے لئے ترستے ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرے، گھٹتی گھٹتی سانسوں کے درمیان سینے کا ابھار زور زور سے دھک دھک بھی کرے اور دور بہت دور بھاگتے بھاگتے آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھیلتا ہوا سا محسوس کر کے ہمت ہار جائے۔ جب کہ دست و پا ہو کر اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتے ابھرتے، تھکتے اور لڑکھڑانے کے باوجود گرتا پڑتا آگے ہی آگے بڑھتا رہے۔ بڑھتا ہی چلا جائے۔

تبھی یکا یک سڑک کے آخری موڑ پر ٹھہری جیپ کے اندر بیٹھے سپاہیوں میں سے ایک سپاہی اپنے آفیسر سے مخاطب ہو کر کہے۔

"کہیئے سر! کیوں نہ اس بھاگتے حرام زادے کے جسم کو گولیوں سے بھون ڈالا جائے۔ لگتا ہے کوئی جیل سے بھاگا ہوا دہشت گرد ہے۔"

نہایت مستعدی دکھاتا ہوا وہ سپاہی ہاتھوں میں تھامے بندوق کے دستے پر گرفت مضبوط کر کے ایک سمئے تک آفیسر کو سوالیہ نظروں سے گھورتا رہے۔

اس کی حسد کے برعکس لمحہ بھر آفیسر ماحول سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے حکم دے دے۔

"جانے دو سالے کو۔"

جسے سن کر قیدی کا دل نہ صرف جان کے امان کے خیال سے باغ باغ ہو جائے جب کہ برسوں سے ایسادہ چنار کا درخت سکھ کا لمبا سانس لے کر نہال ہو جائے۔

یہ تو قیدی کا نصیب کہ فوجی آفیسر کے منہ سے "جانے دو سالے کو" کا تحکمانہ فقرہ صادر ہوا۔ ورنہ مدتوں سے یہاں شعوری اور غیر شعوری دونوں طور پر ہر طرح کا عمل دوہرایا جاتا رہا ہے۔ نہ کوئی لحاظ نہ کوئی مروت، نہ کسی کو بخشا گیا اور نہ اس پر کسی نے اظہار تاسف ہی کیا۔ بس کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود گرتے ہوئے بے جان مورتیوں کی طرح بے حس بنے رہے۔

(۲)

مگر چوں کہ ایسا نہیں ہوا۔ جب کہ ایک کڑیل نو جوان جیل کی سلاخوں سے رہائی پا کر باہر نکلتا تو ہے۔ لیکن رہائی کے خوشی سے پھولے نہیں سما تا ہے۔ اچانک اس کے پژمردہ چہرے پر ایک مسکراہٹ آتی اور جاتی ہے۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک آزاد پنچھی کی طرح بے خوف جدھر چاہئے، آسمان کی وسعتوں میں اڑان لے سکتا ہے۔

یہ سوچ کر ایک نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ پختہ سڑک پر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نکل پڑتا ہے۔ جیل خانہ سے گھر کا سفر دور نہیں ...... راستہ جانا پہچانا ہے۔ شاید یہ اس کا معمول کا راستہ کالج جانے اور آنے کا رہا ہوگا۔...... وہ مدتوں بعد قید کی کھٹنائیوں اور اذیت ناک ماحول سے چھٹکارا پا کر ایک نئی دنیا میں آ گیا ہے۔ ایک لمحے کو خوشی سے سواگت کرتے خیال رتھ پر ادھورے سپنوں کو پورا کرنے کی چاہت میں آگے بڑھتا ہے۔ سامنے ان بکھرے خوابوں میں اس کی بیوہ ماں کی روہانسی صورت کے پیچھے ساکت ہاتھوں میں جوان بہن مہندی رچانے کے انتظار میں بجھی بجھی نگاہوں سے تکتی جارہی، کوئی سوچ لئے ایک نئی دنیا بسانے کو بے قرار نظروں سے دیکھی محسوس کرتا ہے۔

سورج بادلوں کی اوٹ میں چلا جاتا ہے۔ ایک سفید جل پنچھی کی طرح سفید بادل کا ٹکڑا آسمان کے آنگن میں دکھائی دیتا ہے اور مدہوش کرنے والی بھینی بھینی ہوائیں جلترنگ کرتی بدن سے ٹکراتی اس کے گود میں منڈلانے لگتی ہیں۔

کسی گہری سوچ میں ڈوبا ایک نئی شروعات کرنے کو اس کے قدم گھر کی اور اٹھ رہے ہیں۔ گھر تک پہنچ جانے میں اب پچاس گز کی مسافت باقی ہے۔ سڑک کے آخری سرے پر تب اچانک ایک جپسی نمودار ہو کر پاس آ کھڑی ہوتی ہے۔ قریب آتے ہی چند فوجی ماحول کو مزید بگاڑ دینے کے انداز میں نو جوان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ لوگوں کی ایک کثیر تعداد مبہوت بنے دیکھتی رہ جاتی ہے۔

ایک مونچھوں والا پاس آ کے افسر سے آنکھ ملاتا ہے۔ فوراً آنکھ دبانے کا

مطلب سمجھ کر وہ شرارت آمیز لہجہ میں (Halt) ہالٹ کی آواز دیتا ہے۔

فضا میں دیر تک اس کی ریچھ جیسی آواز گونجتی ہے۔ دفعتاً بندوق کے بولٹ پر انگلی کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ انگلی نقل وحمل کرتی ایک سنسناہٹ پیدا کرتی ہے۔ پھر تڑاخ سے ایک آواز فضا کو چیر کر نکل جاتی ہے۔

آس پاس پڑوں پر بیٹھے پرندے پھڑ پھڑاتے آسمان کی بلندیوں میں اڑان بھرتے ہیں......!

اب کی بار بوڑھا چنار کا درخت لرز کر رہ جاتا ہے۔ اپنے قدموں میں سڑک پر اس نوجوان کو گرتے دیکھ کر ایک آہ بھر لیتا ہے۔ جو جیل سے ابھی ابھی چھوٹ کر گھر پہنچنے سے پہلے ہی داغ مفارت دے گیا ہے۔ اس پر اپنے پتے ڈال کر اپنی تعزیت جتانے لگتا ہے......!!!

............☆☆☆............

گمشدہ صدائیں

کہانی چھوٹی سی ہے۔!

پھر یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہی کہ بستی میں نورتی کی حالت غیر ہوگئی ہے۔ ہمیشہ بین بین کر کے روتی رہتی ہے جیسے کوئی زہر سے بُجھا ہوا تیر اسکے جگر کو آر پار ہوگیا ہو۔

اُس کے دل پر پہلی چوٹ اُس دن لگی تھی جب اُس کا بیٹا کریک ڈاون میں پکڑا گیا تھا۔ دوسری چوٹ تب لگی جب بستی کے ہر آنگن میں برسات کی بارش کی طرح یہ خبر برس کر پھیل گئی کہ نورتی کے اکلوتے بیٹے کو شہید کر دیا گیا ہے۔

بیٹے کی شہادت کی خبر پاتے ہی وہ پاگل سی ہوگئی تھی۔ بے ترتیب اور بے ڈھنگ حالت میں دکھوں کی مورت بنی، ہر کسی کو سحر زدہ تکتی رہی۔ اس کی آنکھیں جیسے بے نُور ہو گئیں۔ رُو رُو کے بالکل سُوکھی وخشک، ان میں نمی تک نہ تھی۔

اُس کا گلا بُری طرح سوکھ گیا اور جگر چھلنی ہوگیا۔ زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری کائنات یک لخت سمٹ کر رہ گئی تھی اور پھر اسکے سامنے ایک گہرا اندھیرا سا پھیل گیا جیسے وہ کسی گہرے کنوئیں میں دھنستی چلی جا رہی ہو۔ نیچے...... بہت نیچے......!

کتنی لاچار لگ رہی تھی اور بے بس بھی...... دیوار سے سر ٹیک دینے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ شہر میں تناتنی چل رہی تھی۔ پھر یہ خبر آناً فاناً پھیل گئی کہ ایک بے گناہ شہری کو تفتیش کے دُوران زدوکوب کر کے ہلاک کر دیا گیا ہے۔ پلک جھپکتے ہی شہر و گام یہ خبر پہنچی۔ نئی نئی افواہیں اڑنے لگیں۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ اخباروں میں بھی جلی

اور موٹے حروف کے ساتھ سرخیاں لگ گئیں۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ لواحقین کو مرحوم کی نعش نہیں دی گئی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ میت کہاں اور کس مقام پر دفنائی گئی ہے۔ کوئی کہتا کہ کسی نامعلوم کال کوٹھری کی نذر کی گئی ہے۔ ٹرخانے کی خاطر یہ بھی کہا جاتا کہ اُسے رہا کیا گیا ہے۔ طرح طرح کی باتوں سے دل بہلایا جاتا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ پھر یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں تھی۔ کیونکہ برسوں سے یہاں یہی ریت چلی آرہی تھی۔

گھر میں چاروں طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ سارا ماحول بوجھل اور مکدر ہو گیا تھا۔ دُور کھڑا علی بٹ سحر زدہ اس پنجرہ کو تکتا جا رہا تھا۔ جہاں ایک زمانے میں ایک طوطا ہوا کرتا تھا۔ اب نہ وہاں وہ طوطا تھا اور نہ ہی اس کی چہکار سنائی پڑتی تھی۔ بس ایک خالی پنجرہ رہ گیا تھا۔ جس کے اندر رکھے کٹورے میں سوکھے امرود کے ٹکڑے پڑے تھے۔

وہ کھڑکی کے باہر اڑتے دھول کے بگولوں کو دیکھتا رہتا۔ جہاں ایک کچا راستہ اُس نزدیکی پہاڑی کی طرف جاتا تھا۔ وہاں پہاڑی پر ایک بڑا قبرستان واقع ہے۔ جہاں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ لوگ مرحومین کے حق میں فاتحہ خوانی کے لئے آتے تھے۔

ایک دن بستی میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگوں کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ ایک سے دوسرے کے کان تک یہ خبر پہنچ گئی کہ برسوں بعد بستی کے ایک نوجوان کو جیل سے رہا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے آنے کی خبر ساری بستی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔

جانے کیسے یہ بھنک نوریؔ کے کانوں میں بھی پڑی۔ وہ اُسے دیکھنے کے لئے بڑی اتاولی ہو رہی تھی۔ اس کے بیٹے کے ساتھ اس کا پرانا دوستانہ تھا۔ ایک عجیب بے چینی سی اس کے اعصاب پر پوری طرح چھائی جا رہی تھی۔

قبل اس کے نوریؔ اکثر خوشی و غم کے موقعوں پر لوگوں سے ملنے سے گریز کرتی تھی

اور ہچکچاتی۔ پھر کوئی اُسے زبردستی مجبور کر دیتا تو وہ جذباتی ہو جاتی...... اس کے اندر کی ممتا

جا گنے لگتی۔ دیکھتے دیکھتے ہی اس کی خالی خشک اور سوکھی چھاتیوں سے کسی کے منہ مارنے کے احساس ہونے پر جیسے دودھ سے بھرا جاتا اور پھر اس کا آنچل لہرانے لگتا۔ یوں وہ زیادہ تر اپنا وقت تنہائی میں رہنا پسند کرتی تھی۔

مگر تنہائی میں رہ کر بھی جیسے ہی کوئی مبہم سا خیال کہیں نورتی کے تحت الشعور سے اٹھ کر شعور میں کلبلانے لگتا۔ اس کے اندر خالی پن اور اداسی کا احساس جاگزین ہو جاتا تھا۔ مدتوں سے ایک نامعلوم کرب جو اسکے اندر پنہاں تھا...... جب کبھی کوئی بادِ مخالف جھونکا اس کے در پر دستک دیتا۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگتی اور آہ وزاری کرتی ہوئی کہتی۔

''تو کدھر چلا گیا ہے؟ مجھے کس حال پر چھوڑ دیا ہے؟۔ اب میں کیا کروں؟ کس کے لئے جیوں؟ موت بھی آتی نہیں......''

پھر علی بٹ سے مخاطب ہو کر کہتی۔

''یہاں بیٹھے بیٹھے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ جاؤ کہیں اس کی قبر کو ڈھونڈ نکالو۔''

کوئی اُسے لاکھ بار بھی سمجھائے مگر وہ اپنے کئے کرنے سے باز نہیں آتی اور نہ ہی ان کی باتوں کو اس پر کوئی اثر ہو رہا تھا۔ وہ ہر ایک کو الٹے سیدھے لہجے میں پاٹھ پڑھاتی۔ گاہے گاہے الٹی سیدھی حرکتیں بھی کرتی رہتی۔

اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ ہمیشہ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہتا رہتا تھا۔ جو کبھی تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ جس میں نہ جانے کتنے ارمان بہتے تھے۔ اس بات کا خود اُسے پتہ نہیں تھا۔

اس ادھیڑ بن میں اُسے جینے کے لئے ایسا ماحول چاہئے۔ جہاں وہ آرام وسکون سے زندگی کے باقی دن کاٹ سکتی۔ مگر اس کی بدقسمتی یہ رہی کہ اس کی زندگی میں ایک ایسا ذلزلہ آ گیا تھا نیلگیوں فلک پر کل تک جو ننھا ستارہ چمک رہا تھا۔ اچانک ہی مغربی کی سمت آوارہ بادلوں کے بے ترتیب گہرے دہلیز اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔ یوں اس کے خوابوں کا بہتا ہوا آبشار یکایک خاموش ہو گیا۔

جانے کب سے علی بٹ گم صم بیٹھا تھا۔ اپنے دل پر بھاری پتھر رکھکر نوری کو سمجھاتا رہا اور اس کی ڈھارس بندھا رہتا۔ یہ صورت حال اس کے لئے نہ صرف پریشان کن تھی بلکہ گھر کی حالت بھی خستہ ہو چکی تھی۔ اُس نے آیت الکرسی پڑھ کر نوری پر کئی بار دم کیا اور اسکا دھیان دوسری طرف مائل کرنے کے لئے بہتر نسخہ آزمائے۔ مگر نوری کے دل میں اتنا اضطراب تھا کہ پل بھر وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔

علی بٹ کو یاد آیا۔

ایک بار نوری کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ چوبیس گھنٹے بے ہوش رہی۔ پھر قدرے کچھ حالت ٹھیک ہوئی مگر ایک ہفتہ بعد پھر بگڑ گئی۔ اس نے اپنی زندگی میں نوری کو کسی قسم کی کوئی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ لیکن ہمیشہ نتیجہ بے سود رہا۔ اُسے ہمیشہ دھڑکا رہتا کہ اگلے لمحے وہ کونسا طوفان کھڑا کر دیگی اس کی خس پوش جھونپڑی کو دب جانے میں ذرا دیر نہیں لگے گی۔ وہ طوفان کب اٹھے گا یہ تو وہ خود نہیں جانتا تھا۔

اب اُس کا وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا اور اس کی ضد کے آگے اپنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ اٹھ کھڑا ہوا اور نوری کو اپنے حال پر چھوڑ کر گھر سے باہر نکل آیا۔

ایک دن وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ کسی سمت کا تعین تھا اور نہ ہی وہ کوئی فیصلہ کر پا رہی تھی۔ بس یونہی بے ساختہ چلتی جا رہی تھی جیسے کسی بادبان کے بغیر محض لہروں کے رحم وکرم پر اپنی زندگی کی ناؤ کو چھوڑ گئی ہو۔

اچانک اس کے بہکے بہکے قدم پہاڑی کی اُس اونچے ڈھلان کی طرف بڑھ گئے۔ جہاں ایک کھلا کشادہ میدان دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے گرد سفیدے کے درختوں کے جھنڈ قطار در قطار کسی فیصل کی طرح کھڑے تھے۔ جن پر رنگ برنگ کے طائران نے گھاس پھوس کے تنکوں کو جوڑ کر اپنے اپنے آشیانے بنائے تھے۔ ان پیڑوں پر چڑیاں چہکتی اور پر پھڑ پھڑاتے رہتی تھیں۔ لیکن اکثر لوگ ان کی یہ آوازیں بے کیف اور بے سُر محسوس کرتے تھے۔ پاس کھڑے ایک اونچے پیڑ کی ٹہنی پر ایک سبز رنگ کا جھنڈا لہرا رہا

تھا اور بیچ پیڑ کے تنے حصے پر ایک زنگ آلودہ پرانا ٹین کا بورڈ آویزاں تھا۔ جس کی پیشانی پر جلی حروف میں ''مقبرہ اہل اسلام'' لکھا ہوا تھا۔

وہ پیڑوں کو عبور کر کے اس مقام پر آ گئی تھی۔ جہاں نامعلوم جگہوں کے نامعلوم لوگوں کی قبروں کا سلسلہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا اور ان قبروں میں وہ لوگ مدفن تھے جو پچھلے پندرہ سولہ سالوں کے دوران شہید ہو گئے تھے۔ کہیں کسی قبر کے سرہانے پر سنگ مرمر کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ جس پر نام ولدیت اور سکونت کے علاوہ تاریخ شہادت کندہ تھی۔ جب کہ بڑی تعداد میں دوسری قبریں شناختی کتبہ نہ ہونے کی بناء پر ماتم کناں تھیں۔

نوری کچھ دیر اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ پھر دبے قدموں اس قبر کے پاس آ کر رک گئی۔ جس کے سرہانے پر کسی نے تازہ دم تحریر کردہ پتھر نصیب کیا تھا اور حسب معمول مدفون کے متعلق ساری تفصیلات درج تھیں۔ البتہ تاریخ شہادت پرانی لکھی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے حال ہی میں اس کی قبر کی شناخت ہوئی ہو۔

اُس نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ جب اُسے وہاں کوئی دوسرا نیا کتبہ نظر نہ آیا تو وہ پیچھے مڑ کر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ چند قدم آگے بڑھی۔ وفعتاً اُسے کسی کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ ساکت جامد ہو گئی جیسے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہوں۔

وہ رُک گئی اور پلٹ کر دیکھا۔ درختوں کی اوٹ میں ایک اجنبی مرد کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا جو ہو بہو علی بٹ کے خدوخال اور شکل وصورت کا تھا وہ حیران سی ہو کر رہ گئی اور گمان کرنے لگی کہ کہیں یہ مرد علی بٹ نہیں۔ جو اس کے آنے سے قبل ہی یہاں پہنچ چکا ہے۔ مگر دوسرے ہی پل اس وقت اس کی حیرانگی دُور ہوئی جب اُس اجنبی مرد نے متجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

''کیوں بہن! کیا ابھی تمہاری تلاش ختم نہیں ہوئی جس کی قبر دیکھنے کو کبھی کبھی یہاں چلی آتی ہو......'' آواز میں کتنی لوچ اور کتنا درد تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنا غم بھول گئی تھی۔

''بھائی! جانے کب وہ گھڑی آئے اور میری مراد پوری ہو۔ ایسے ہی کتنے

قبرستانوں کے ان گنت بے نام قبروں میں ان کی قبر کو تلاش کرنا میرے لئے محال ہے۔ یہ درد میرے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ لہٰذا میں یہاں چلی آتی ہوں کہ کبھی نہ کبھی کوئی سراغ ہاتھ آئے۔"

"ہاں! تمہاری طرح اس افتاد میں اور بھی لوگ ہیں جو گمان کرتے ہیں کہ آج نہ کل ان کے عزیزوں کی قبروں کی شناخت ہوگی۔ مگر ابھی تک معاملہ یونہی لٹکا ہوا ہے۔ مجھے دیکھو! پانچ سال پہلے میرا بھائی بھی گولی لگنے سے شہید ہو گیا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ اُسے اسی مقبرے میں دفنایا گیا۔ آج تک اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کس جگہ پر اُسے دفنا دیا گیا ہے۔"

"یہ بالکل سچ ہے کہ بہت سے لوگ اپنے عزیز و احباب کی شہادت اور ان کی قبروں کے متعلق کچھ نہیں جانتے" نوری گلوگیر آواز میں بولی۔ چونکہ دونوں کا غم ایک جیسا تھا۔ اس کے جذبات کو فوراً محسوس کر لیا۔ اچانک اجنبی مرد کی آواز رندھ ہو گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بند گئیں۔

چند ساعتوں کے بعد اس کے دل پر جو غبار جما تھا، ہٹ گیا۔ پھر وہ دُوبارہ بول پڑا "دراصل میں یہاں سے دُور ایک مفصلاتی دیہات میں رہتا ہوں۔ کسی کام کے سلسلے میں میرا بھائی شہر آ گیا تھا۔ اچانک شہر میں بھگدڑ مچ گئی اور اس کھلبلی میں وہ گولی کا نشانہ بنا۔" پھر تھوڑی دیر تک توقف کرنے کے بعد بولا۔

کتنے ہی ایسے ماں باپ بیوی اور بچے ہوں گے جو اپنے لخت جگروں کی قبروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔ یہ جاننے کے لئے تڑپ رہے ہوں گے۔ مچل رہے ہوں اور ترس رہے ہیں۔

میرا حال دیکھو! بچے میری بھابی سے اپنے باپ کے متعلق پوچھا کرتے ہیں کہ کب پاپا آئے گا وہ کیوں روٹھ کر گئے۔ تم انہیں منانے کیوں نہیں جاتی ہو۔ آخر وہ کہاں ہیں...... دیر رات گئے تک روتے بلکتے رہتے ہیں انہیں بھابی منا لیتی ہے پھر سلا دیتی ہے......"

"ہاں یہ سچ ہے ... ایک ... تو انگلیوں کی پوروں پر گنے جاتے۔

شاید ہی ایسی کوئی جگہ خالی ہوگی جہاں سیکڑوں کی تعداد میں بے نام قبریں نہیں ہونگی......''

یہ کہتے ہوئے نوری کی آنکھوں سے دو۲ آنسوں ڈھل کر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔اس کی آواز بھر آئی۔مزید کچھ کہنے کو اس کے ہونٹ کپکپا اٹھے مگر اسکا دکھ اس کے وجود پر اتنا بھاری تھا کہ کچھ نہ بولی اور نہ بول پائی۔اس بار زاس کی غمناک آنکھیں آسمان کی جانب اٹھیں تھیں۔

دور آسمان کی بے پناہ وسعتوں میں جیسے کچھ کھوجنے کی کوشش کرنے لگی اور پھر وہ وہاں سے چل پڑی......!!!

............☆☆☆............

دل جو کہہ نہ سکا

ملا کریم بخش سخت خوف زدہ تھا۔!

وہ زندگی کے اُس بھیانک خواب کو کبھی بھول نہیں سکتا جب اُس نے روح کو بدن سے الگ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا سا اٹھا اور گہری سانسیں لینے لگا تھا۔ اس کا سارا جسم سرد پسینے سے تر تھا۔

اُس نے ایسا کیا دیکھا تھا۔؟ کہ اسکا دل دہل رہا تھا۔ اُسے لگا کہ اُس نے قیامت کا ایک ایسا منظر دیکھا ہے جو بار بار اس کے دماغ میں چکرا رہا ہے اور جس نے اس کی آنکھوں کی بصارت میں ایک ایسی وحشت بھر دی کہ اب دل کی دھڑکنیں بھی جیسے باہر ہوئی جارہی ہیں اور پھر اس کے دل ودماغ اور روح کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔

اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا، نہ ہی اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا تھا۔ اُسے محسوس ہورہا تھا کہ خواب کے اثر سے اس کے سینے میں اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ لہٰذا اس کا فرار ہونا لازمی تھا۔ سو وہ وہاں سے بے تحاشہ بھاگ کھڑا ہوا اور پھر بھاگتے بھاگتے اپنے گھر کی راہ لی۔

جوں ہی وہ اپنے مکان کے آنگن میں داخل ہوا تو آنگن میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا کہ اس کے آنے سے پہلے ہی آسیب زدہ خاموشی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ سناٹے بھرے آنگن میں ہوا سائیں سائیں کرتی چل رہی تھی۔ وہ بھی جیسی زبرون پہاڑی کی نمی اپنے ساتھ لے کر......ورنہ ایسی بھینی بھینی ہوائیں مردہ جسموں میں ایک نئی روح پھونک دیتی ہیں البتہ کبھی

کبھی کتے کے بھونکنے کی آواز کانوں میں گونج رہی تھیں۔

کچھ دیر کے لئے وہ وہاں رُک رہا۔ حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اُسے جیسے کسی انمول چیز کی تلاش ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اس کا ذہنی خلفشار ہو۔

اس کے چہرے کی یاسیت اور عجیب بے چینی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی کا داؤ ہار کر آیا ہے۔ اب سونے سے ہی یہ پریشانی دُور ہو سکتی ہے مگر اس کی آنکھوں سے نیند کب کی اڑ چکی تھی۔

وہ جاگ رہا تھا اور جاگتا رہا۔ وہ جتنا پریشان تھا۔ اس سے زیادہ اس کی بیوی پریشانی میں مبتلا تھی۔ اس کا دماغ جھنجھنا گیا۔ وہ نوری کے بارے میں سوچنے لگا اور اس کی رُوہانسی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔ وہ آگے بڑھا۔ آنگن کے بائیں جانب دیوار کے گوشے میں ٹوکر رکھا اور پھر بائیں کندھے پر لٹکی جھولی اتار کر نیچے چھپا دیا۔ واپس مڑا کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا تو دروزے سے منہ لگا کر آواز دی۔

''نوری او نوری! ذرا دروازہ تو کھولو''

اندر سے کسی ضعیف عورت کی مریل سی آواز سنائی دی۔

''کون ہے تو......؟''

''میں ہوں۔ کریم بخش۔ دروازہ کھولو''

نوری مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر مصلئے پر دوزانو بیٹھی کوئی وظیفہ کر رہی تھی۔ آواز پہچان کر کراہتی ہوئی اٹھی اور دروازے تک جا کر چٹخنی کھول دی۔ کریم بخش نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ سردی بہت تھی اور ساری بستی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

نوری پلٹ کر واپس آ گئی۔ فرش پر بچھایا ہوا مصلاء سمیٹ لیا اور بڑے سلیقے سے تہہ کر کے پاس پڑے زنگ آلودہ صندوق پر سنبھال کے رکھ دیا۔ پھر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ کریم بخش کسی خیال میں ڈوبا ہوا اپنی نیم آنکھوں سے اس کی

طرف ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ یوں ہی چند لمحے گزر گئے۔

نوریؔ سے دیر تک اسکا چپ رہنا برداشت نہ ہوا تو اُسے بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تناؤ عجیب سی اُلجھن محسوس کی......وہ پہلے سے کچھ زیادہ اُداس اور مفطرب نظر آرہا تھا۔ وہ جھنجھلاتی سی گئی قدرے بوکھلا کر تلخ لہجہ میں بولی۔

''یوں خاموشی کیا سوچتے ہو۔ کچھ تو بولو۔ کیا کہیں اسکا سراغ ملا......؟''

ملا کریم بخش نے اپنی ادھ کھلی آنکھیں پھیلاتے ہوئے نوریؔ کی طرف دیکھا مگر اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ گردن نفی میں دائیں بائیں گھماتے ہوئے بے خیالی میں کچھ بُدبُدایا۔

''ہوں......!''

یہ ہوں۔ ہوں۔ کیا لگا رکھی ہے۔ اسکا مطلب کیا ہے اور تم اتنے دن کیا کرتے رہے تھے؟''

کریم بخش سوچتا رہا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اگر تھا بھی۔ تو اس کا کوئی معقول جواب بن نہیں پا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی لب کشائی سے نوریؔ کی جان جا سکتی ہے۔

نوریؔ ماں تھی۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کا درد نمایاں تھا۔ ایک التجا تھی۔ ماں ہونے کے ناطے اس کے پوچھنے کا حق کوئی چھین نہیں سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا بیٹا کئی مہینوں سے لاپتہ تھا۔

ملا کریم بخش کے منہ پر جیسے تالا پڑا تھا۔ دیر تک جب اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ نوریؔ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ تیز آنچ پر چڑھی ابلتی ہوئی ہانڈی کی طرح غصے میں بھڑک پڑی۔

''کچھ بتاؤ گے بھی......''

''کیا بتاؤں۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے''

''تجھے قسم ہے میری، سچ سچ بتاؤ۔ کچھ سُنا اسکے متعلق ......'' اب کی بار اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ نوری کی اونچی آواز کچھ نرم سی پڑ گئی تھی۔ اس کے لب و لہجے کی مایوسی دیکھتے ہی کریم بخش لمبی سانس کھینچ کر ہلکلاتے ہوئے بڑبڑایا۔

''کک۔ کیا بتاؤں'' میں......'' وہ کچھ اور کہتا۔ اچانک اس کی بات حلق میں جیسے اٹک گئی۔ اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نوری کو کیا سمجھائے اور کیسے سمجھائے کہ......''

وہ اتنا ہی کہہ پایا کہ اسکے دل کے گہرے مندمل زخموں کے ساز پھر بج اٹھے۔ چونکہ یہ اس کے لئے ایک مشکل ترین لمحہ تھا۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس کی پیشانی پر پسینے کی بے شمار بوندیں پھوٹ پڑیں اور چہرے پہ خوف و بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ پیچ وتاب میں کچھ کہہ دینا بھی نہیں چاہتا تھا۔

جسے سننے کے لیے نوری بے تابی سے گھورتے ہوئے بار بار اپنا پہلو بدل رہی تھی۔

ملا کریم بخش کی آواز میں کپکپاہٹ پیدا ہوگئی۔

وہ جانتا تھا کہ نوری پہلے ہی جل کر کوئلہ ہو چکی ہے۔ اب تو بالکل راکھ ہو کر رہ جائیگی۔ بیٹے کی جدائی پر سوکھ کر ویسے بھی اس کی حالت اسپتال سے چرائی گئی لاش سے کم نہ تھی۔ سکڑا سکڑا بدن۔ زرد مرجھائے ہوئے چہرے کے اندر دھنسی دھنسی آنکھیں، لرزتے سوکھے خشک سوکھے ہونٹ، شانوں پر دیوانیوں جیسی بکھرے بے ترتیب بالوں سے لگتا تھا کہ مصیبتوں سے تھکی ہاری وہ اپنے اندر خالی پن اور اداسی سموئے پیڑ کے کسی سوکھی ٹہنی کی طرح ہو کے رہ گئی ہے۔

معلوم نہیں کہ ملا کریم بخش کہاں کہاں سے اور کس کس شخص سے مل کر بڑی نڈھال حالت میں لوٹ آیا تھا۔ اب تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ یوں وہ روحانی جسمانی اور نفسیاتی طور پر بھی شکست خوردہ ہو گیا تھا۔

ملا کریم بخش بہت خوف زدہ تھا۔

افسردہ اور پریشان تھا۔ گم صم مغموم چہرے لئے دیوار سے لگ کر خم وار کمر کو سیدھا

کر کے تن کے کھڑا تھا۔اس کے باوجود نڈھال بدن میں جورتی بھر توانائی موجود تھی۔وہ بیٹے کے غم میں پہلے ہی آہستہ آہستہ زایل ہو چکی تھی۔گو اس کے جسم کی ساخت سے لگتا تھا جیسے ہڈیوں کے پنجرے میں نئی جان ڈال دی گئی ہو اور اس پر موٹی کھال نام کی چیز چڑھاوی گئی ہو۔یوں وہ پوشاک اور وضع قطع کے اعتبار سے بھی ایک بھکاری جیسا معلوم ہوتا تھا۔

گو کہ باپ کی وفات کے بعد اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد کے ساتھ ساتھ گورکنی کا آبائی پیشہ بھی اس کے اختیار میں آ گیا تھا۔اب اس پیشے سے اس کے گھر کی کفالت ہوتے ہوئے ایک مدت گزری تھی۔اس دوران نوری سے نکاح کے بعد ایک نرینہ اولاد ان کے گھر میں رونق بنی۔جسے پڑھا لکھا کر میٹرک کے درجے تک پہنچا دیا۔

میٹرک پاس کرتے ہی اسلم اچھی سی نوکری کا خواہش مند تھا اور جس کی تلاش میں دفتروں کی خاک چھاننا پڑی مگر ہر بار ناکامی سے واسطہ پڑتا رہا۔دیکھنے میں بڑا خوبصورت اور ذہین تھا۔ساتھ ساتھ بڑا فرماں بردار اور اطاعت شعار بھی۔بچپن سے صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔چہرے پر گھنی داڑھی مونچھ سے کسی بارعب شخصیت ہونے کا گمان ہوتا تھا۔شاید اس بنا پر وہ بستی کے لوگوں میں ہر دلعزیز تھا۔

اچانک ایک دن سارا شہر فساد کی زد میں آ گیا تھا۔لوگ انگشت بدنداں اور حیرت کا مجسمہ بنے رہے۔دیکھتے ہی دیکھتے ان کی زندگی کا قافیہ تنگ ہونے لگا تھا۔جگہ جگہ مکانوں کو آگ لگائی جا رہی تھی اور کئی سینکڑوں جانیں تلف ہو رہی تھیں۔خون ریزی اور عصمت دری کی وارداتیں رونما ہو رہی تھیں۔حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے کئی اقدامات بھی اٹھائے گئے تھے۔کہیں کریک ڈاون اور کہیں کرفیو نافذ کیا گیا تھا اور وہ بھی جانے کتنے دنوں تک۔غالباً دو دو تین تین دن تک۔

مگر مصیبت یہ تھی کہ جو بھی جوان پکڑ دھکڑ میں آ جاتا تھا تو اس کی جان کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی تھی۔پہلے تفتیش سے اس کی ہڈیوں اور پسلیوں کو توڑا جاتا پھر جب موت کے دہانے سے بچ بھی نکل جائے تو فوراً کسی کال کوٹھڑی میں ٹھونس دیا جاتا تھا۔ورنہ ملک

دشمن قرار دیکر اور مار مار کر بے دم کر کے اس کی نعش کو کسی نا معلوم ویران جگہ پر بے گور و کفن دفنایا جاتا یا کبھی چیلوں اور گِدھوں کے حوالہ کر دیا جاتا تھا۔

ایک دن جب اسلم کسی کام کے سلسلے میں اپنے گھر سے نکلا۔ تب سے وہ واپس لوٹ کر نہیں آیا اور نہ ہی کسی نے کہیں اُسے دُوبارہ دیکھا۔ نجانے وہ کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ بستی میں اس کی گمشدگی ایک معمہ بنکر رہ گئی تھی۔ بیٹے کے غائیب ہونے کے غم میں دونوں میاں بیوی خوب روئے۔ روتے روتے ان دونوں کی آنکھوں کا پانی بھی سوکھ گیا تھا۔ ملا کریم بخش پاگلوں کی طرح گھومتا اور تلاشتا رہا۔ شہر کا چپہ چپہ اور کونا کونا چھان مارا مگر ہر جگہ ہاتھ ملتا ہوا لوٹ کر آیا۔

دیکھا جائے تو ہر شہر اور ہر بستی میں اچھے لوگوں کے درمیان شعبدہ بازوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ بستی میں کسی نے یہ افواہ اڑائی تھی کہ لالچوک میں نقاب پوشوں کے ساتھ گاڑی کے اندر اسلم کو دیکھا گیا ہے۔ دوسرے دن ملا کریم بخش اپنے دل کی آس لئے اسلم کی تلاش میں شہر شہر گام گام ڈھونڈنے نکل پڑا۔ مگر ہر جگہ سے مایوسی کے سوا کچھ نہ اس کے ہاتھ آیا۔ شاید قدرت نے اس کے معاملے میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔

اب کی بار جب کہ وہ گھر سے نکل رہا تھا کہ آتے وقت اس نے ایسا منظر دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ خواب کے اثر سے اس کے سینے میں اسکا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ سوچتا رہا اور جھنجھلاتا رہا۔

نوری اس کے خوفزدہ چہرے پر بدلتے ہوئے اتار و چڑھاؤ کی رنگ برنگ کیفیت کو سلجھا ہی رہی تھی کہ کریم بخش دیر تک کھڑا رہنے کے بعد تھک کر فرش پر لیٹ گیا۔ نا اُمید ہو کر اس کی نم ناک آنکھیں آسمان کی طرف ٹکی ہوئی تھیں۔ باہر کسی کے ریڈیو سے آواز سنائی دے رہی تھی۔

بول نہ ہلکے ہلکے بول نہ ہلکے ہلکے
ہونٹ سے ہلکے ہلکے بول نہ ہلکے
آ نیند کا سودا کریں اک خواب دیں اک خواب لیں
اک خواب تو آنکھوں میں ہے اک چاند کے تکیہ تلے

کتنے دنوں سے یہ آسمان بھی سویا نہیں ہے
اس کو سُلادیں بول نہ ہلکے ہلکے

اسی اثناء میں نورؔی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اُسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔

کریؔم بخش کی حالت قابل رحم تھی...... اور اُسے کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ نوری ہی کیوں نہ ہو۔ پھر بات جہاں تھی وہیں جمی رہی۔ نورؔی منہ لٹکاتی ہوئی اس کے زیادہ قریب آ گئی اور ایک نرم ڈلی کی طرح اس کے سینے سے جا لگی۔ پھر دیر تک سینے سے چپک کر بین کر کے روتی رہی اور کریم بخش ڈھارس بندھاتا رہا۔

تھک کر جب وہ سنبھل گئی تو ایک ہاتھ سے کریم بخش کی قمیض کا گھیرا اوپر پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پچکے سینے پر مالش کرنے لگی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے دل و دماغ کے دریچے کھل جائیں اور جو کچھ اس کے اندر لاوا ابل رہا تھا زبان پر آئے۔ شاید کہیں کوئی گڑبڑ تھی جسے وہ کان لگا کر سننے کے لئے بیقرار تھی۔

"کریما! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو صاف صاف بتا دو۔ میں برداشت کر لوں گی۔ اگر خدا نے یہی چاہا تھا۔ میں کون ہوتی ہوں اس کے معاملے میں ٹانگ اڑانے والی۔ تیری اس خاموشی سے میری جان نکلی جا رہی ہے"

"کہا نا۔ کچھ بھی نہیں ہے۔"

نورؔی چپ رہنے والوں میں سے کہاں تھی۔ وہ اس کی داڑھی میں انگلیاں پھنسا کر کنگھی کرنے لگی۔ دیر تک ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"اگر کچھ نہ بولا تو تم میرا مرا منہ دیکھو گے۔ میں تجھے اسلم کا واسطہ دیتی ہوں۔ بتاؤ نا......"

نورؔی بالکل دیوانی سی ہو گئی تھی۔ بار بار وہ پوچھے جا رہی تھی۔ اس کے دل میں شک کا کیڑا چلا تھا۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ غصے میں آ کر

اس کے گریباں کو کیلے کے چھلکے کی طرح پھاڑ دیگی۔ ایسا نہیں کر سکتی تھی تو اپنے کالے بھدے دانتوں سے اس کے سینے کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالتی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ملا کریم بخش کا دل پسیج گیا تھا۔ بے بس اور لاچار ہو کر اس نے اپنے ہتھیار نوری کے سامنے ڈال دیئے۔

''بتاتا ہوں''

ملا کریم بخش دیر تک سوچتا رہا۔ وہ موزون الفاظ کی تلاش کر رہا تھا کہ نوری غصے سے بھرائی۔ اس کی جانب دیکھتی ہوئی پاگلوں کی طرح چیخی۔

''ہاں! سناتے کیوں نہیں؟ کیا ہوا۔؟''

ملا کریم بخش کی آواز گلے میں رندھ گئی اور ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اس کا منہ خشک ہو گیا اور زبان سوکھی گئی۔ پھسی پھسی انداز میں اس قدر کہا۔

''میں ناکام اور نامراد ہو کر گھر کی طرف آرہا تھا۔ یہاں سے دُور اس بستی میں جہاں ایک عرصہ پہلے لکڑ ہار کے بیٹے سے تمہاری منگنی ٹوٹ چکی تھی پہنچ گیا۔ بستی کا ایک نوجوان کسی بہتے ہوئے دریا میں غرق ہو گیا تھا۔ اس کی تجہیز و تکفین کے لئے کوئی گورکن مُوجود نہ تھا۔ شاید وہ کسی کی شادی کی تقریب میں گیا تھا۔ اتفاق سے ایک شناسا نے مجھے دیکھ کر مرحوم کو دفنانے پر اصرار کیا۔ میں نے سوچا۔ چلو اچھا ہوا۔ ثواب کی نیت میں کچھ اُجرت ملے گی۔ اس میں حرج ہی کیا ہے اور پھر میری جیب بھی بالکل خالی تھی۔''

نوری خاموش سنتی رہی۔ ابھی بات بند مٹھی کی گرہ سے باہر نہ آئی کہ وہ بیقرار ہو کر پوچھ بیٹھی۔

''ہاں! پھر آگے کیا ہوا۔؟؟''

''ظہر کا وقت تھا۔ مرنے والا ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ یہی کوئی اس کی عمر اٹھارہ بیس سال تھی۔ میں نے مقامی گورکن کے گھر سے عارتاً کچھ ضروری کھودنے کا سامان منگوا لیا اور پاس ہی ایک قبرستان میں جا کر اس کی قبر کھودنا شروع کر دی۔ ہاں۔ غلطی سے میں وہ

سامان اپنے گھر لایا......'' کچھ توقف خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔قبر تکمیل پا کر پہلے لاش کو نہلایا اور دُھلایا۔ یہاں سے فارغ ہو کر دُوبارہ سیدھا قبرستان چلا آیا۔اتنے میں لوگ بھی نماز جنازہ سے فارغ ہو چکے تھے۔میت کو اپنے کاندھوں پر سوار کر کے اس کا تابوت لایا۔

اچانک ملا کریم بخش کی آواز دھیمی پڑ گئی جیسے اس کی آواز اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔مزید کچھ کہنے کو اس کے ہونٹ کپکپاہٹ اٹھے اور چہرے پر شکنوں کا جال مکڑے کے جالے کی طرح بن گیا۔

نوری کچھ دیر خاموش رہی پر بے آب مچھلی کی طرح تڑپ کر بولی۔'' کہونا۔چُپ کیوں ہو گیا تو ......؟''

''بتا دیتا ہوں۔جب اس نوجوان کو قبر میں اتار رہا تھا تو اچانک لحد کی دیوار دب گئی۔انجان دوسرے آدمی کی کفنائی ہوئی لاش باہر نکل آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک معطر خوشبو پھیل گئی۔جانے کیوں اور کیسے میرے اندر اسکے چہرے کو دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھی۔مجھ سے رہا نہ گیا۔کفن کھول کر دیکھا تو......تو......'' ملا کریم بخش کی زبان لڑکھڑائی ہوئی گنگ ہو گئی اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے نوری کو دیکھتا رہ گیا۔

اُس کے لئے یہ اس کی زندگی کا ایک سنسنی خیز لمحہ تھا جو وہ بیان نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ جب دیر تک وہ کوئی بات کہہ نہ پایا تو نوری حیرت زدہ ہو کر بولی......وہ کون تھا جسے تم نے دیکھا؟''

ملا کریم بخش کا دل دھک دھک کرنے لگا۔''لاش کی شکل وصورت''......اُس نے بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور نوری کے تجسّس بھرے چہرے کی طرف دیکھ کر مایوسانہ انداز میں بولا۔

''وہ اسلم کی لاش تھی۔میں نے اُسے کپڑوں اور بائیں ہاتھ کی چھ انگلیوں سے شناخت کر لیا۔شاید وہ مجھے اپنے پاس بلا رہا ہے'' ...... یہ کہتے ہی ملا کریم بخش سے پہلے ہی نوری۔نے آخری ہچکی لی اور برف کا تودا جیسی ٹھنڈی پڑ گئی!!!۔

............☆☆☆............

نیا منصوبہ

ایک ننھی سی معصوم سی بچی جس کی عمر یہی کوئی آٹھ نو سال کی ہوگی ریلوے اسٹیشن کے قریب بیٹھی خون میں لت پت اپنی بے سدھ پڑی ماں کے سینے سے لپٹ کر پچھاڑیں کھا کھا کے روئے جا رہی تھی۔ وہ بار بار اس کے بدن کو ہلاتی جھلاتی رہی۔ پر اس کے بے جان سے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ آس پاس کے کچھ مسافر معاملے ٹوہ لینے کے ارادے سے تاکا جھانکی کرتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔ مگر اس بھیڑ میں ایسا کوئی نہ تھا جو بلک بلک کر روتی بے بس بچی کو ازراہ انسانیت چپ کرا دیتا۔ آگے بڑھ کر اس کی پریشانیوں کا مداوا کر کے ڈھارس بندھا دیتا۔ دور سے ایک پولیس والا کھڑا دیکھے جا رہا تھا چونکہ پولیس والا معاملہ تھا۔ شاید تھانہ کورٹ کچہری کے ڈر سے کسی میں انسانیت جتانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ لوگ ایک جھلک دیکھ کر نکل جاتے۔ البتہ جاتے جاتے حاتم کی قبر پر لات مار کر پانچ، دس اور بیس روپے کے نوٹ اس کی پھیلی چادر کی طرف پھینک دیتے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کہیں سے ایک پرانی جیپسی نمودار ہوگئی۔ جس کے فرنٹ کے شیشے پر ریڈ کراس کا ایک بڑا نشان لگا ہوا تھا۔ اس میں سے چند کرمچاری اترے اور سبک رفتاری سے نعش کو اسٹریچر کی مدد سے گاڑی میں ڈال کر خود بھی سوار ہو گئے۔ دوسرے ہی پل جیپسی روانہ ہوگئی۔ یہ دیکھ کر لوگ بھی یکے بعد دیگرے وہاں سے کھسک گئے۔ بچی بدستور روئے جا رہی تھی۔ اس کے سامنے بچھی چادر پر پرانے اور نئے کرکرے نوٹ جمع ہو چکے تھے۔ اب وہ وہاں بالکل تنہا اور اکیلی رہ گئی تھی۔ اس نے پرانے

پھٹے فراک کے دامن سے آنکھوں کے بہتے ہوئے آنسو پونچھ لئے اور اٹھ کر چادر پر پڑی ساری رقم کو اکھٹا کر کے مٹھی میں دبائے تیز تیز قدم اٹھاتی اسٹیشن سے باہر نکل آئی۔ ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کر چکی تھی کہ دور کھڑی جیپسی دیکھتے ہی اپنی رفتار بڑھادی۔ قریب پہنچ کر اس نے جیپسی کی کھڑکی کھول دی۔ اندر جھانکا تو ماں کو بستی کے جانے پہچانے آدمیوں کے درمیان بیٹھی اپنے چہرے پر سے خون کے دھبے صاف کرتے پایا۔ تو اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھل اٹھی۔ وہ سبھی خوش سے جھوم اٹھے اور پھر اپنے ایک نئے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ڈرامہ رچانے کی کامیابی پر ایک دوسرے کی داد دیتے رہے۔ جبکہ وہی پولیس کا آدمی اپنے حصے کی کمائی کا تقاضہ کر رہا تھا......!!

شکایت : ایک دن میں کسی کام کے سلسلے میں سڑک پر جا رہا تھا کہ اچانک میرے سر کے اوپر سے رنگ برنگ پرندوں کا ایک غول بڑی سرعت کے ساتھ چہکارتے ہوئے ایسا گزرا کہ میں چونک سا گیا اور عالم استغراق میں دور تک انہیں ٹکٹکی باندھے ہوئے بڑھتا دیکھتا رہا۔ اتفاق سے بے خیالی میں میرا پیر راہ میں پڑے کیلے کے چھلکے پر پڑا ہی تھا کہ اپنا توازن کھو کر تیزی سے پھسلتا ہوا پاس ہی کھڑے ایک بھک منگے سے جا ٹکرایا۔ ٹکراتے ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ مجھے لگا کہ جیسے عینک کے پیچھے چھپے اس کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں سلگ اٹھی ہوں اور ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئی ہوں۔ اس کے پہلے کہ وہ برہم ہو کر کوئی اناپ شناپ کہہ دیتا، میں فوراً ہی عاجزانہ لہجے میں بول پڑا۔ "چوٹ تو نہیں آئی بھا...... بھائی؟"

میرے ندامت بھرے انداز پر وہ قدرے سنبھل گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے رویے میں تبدیلی آئی اور وہ مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان سے متانت بھرے لہجے میں جواباً بولا۔ "نہیں بھائی...... کوئی چوٹ نہیں لگی۔ ایسا لگتا ہے کہ تم بھی میری طرح اندھے ہو۔ ایک اندھے بھائی کو دوسرے اندھے بھائی سے کیسی شکایت" اس کے برجستہ جواب پر میں بوکھلا سا گیا اور مبہوت ہو کر اس کا منہ دیکھتا رہ گیا......!!

بھروپیا :بس کی چھت سے دو آدمی اپنی اپنی اٹیچیاں ہاتھ میں لے کر نیچے اتر آئے۔ایک آدمی کو جب اپنی اٹیچی ہلکی سی محسوس ہوئی تو اس نے دوسرے آدمی سے نہایت انکساری سے پوچھا۔''بھئی! ایسا لگتا ہے کہ غلطی سے ہماری ایک جیسی اٹیچیاں ادل بدل گئی ہیں۔معاف کرنا میری اٹیچی آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے''۔''نہیں بھائی! آپ کسی غلط فہمی کے شکار ہیں۔ یہ دیکھو اس اٹیچی کی لگی پرچی جس پر میرا پورا نام و پتہ لکھا ہے۔ ذرا اپنی اٹیچی کھول کر دیکھو۔دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے؟' دوسرے آدمی نے متانت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ پہلے آدمی نے اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر بری مشکل سے اٹیچی کا قفل کھول دیا۔اٹیچی کا کھلنا تھا کہ اس میں کاغذی گتھے اور پرانے اخبارات کا پلندہ دیکھ کر اس کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ وہ پریشان ہو کر پلٹا اور اس کی تجسس بھری متلاشی نگاہیں اس کو ڈھونڈتی رہ گئیں۔ پہلا آدمی بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا......!!

............☆☆☆............

فراڈی

چھریرے بدن کی سالونی سی پیاری بچی جو سن بلوغ کی دہلیز کو چھو رہی تھی۔ ایک دن اپنی ماں کو بڑی معصومیت سے پوچھتی ہے۔

''اماں! اماں! یہ پھول کسی کو کیوں دیا جاتا ہے؟''

''اس لئے کہ پھول محبت کی نشانی سمجھی جاتی ہے اور ایک دوسرے سے التفات بڑھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔''

ماں نے بڑی لگاوٹ سے بیٹی کو سمجھا دیا۔ اچانک کون سا خیال اس کے ذہن میں اُبھر آیا۔ خاموش نظروں سے اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگی۔ پھر اسے گھورتی ہوئی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر جیسے ماحول کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ دوسرے ہی پل دز دیدہ نگاہوں سے بیٹی کو دیکھ کر پوچھا۔

''لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا بیٹا؟''

''مجھے روزانہ سکول جاتے وقت ندیم گلاب کا سرخ پھول دیتا ہے۔'' اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

ماں نے جب بیٹی کی بات سنی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی۔ جیسے وہ سکتے میں آ گئی ہو پھر سٹپٹا کر غصہ بھرے لہجے میں بول پڑی۔

''خبردار! تم سے کس نے پھول لینے کو کہا تھا۔؟''

''مما! نہ جانے کیوں مجھے اس کی معصوم صورت پر ترس آتا ہے۔ دل

میں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے اور پھر میں اس کی طرف کھنچی سی چلی جاتی ہوں۔اس کے ہاتھوں سے پھولوں کا لینا اچھا لگنے لگتا ہے۔''

بیٹی اپنی انگلیوں سے برابر گلے میں پڑے لاکٹ سے کھیلتی ہوئی شرما کر بولی۔

ماں اس کی باتیں سن کر بھنبھنا اٹھی اور فوراً کسی شیرنی کی طرح غراتی ہوئی بولی۔

''یاد رکھو! دوبارہ اس کم ظرف اور چالباز کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا اور نہ کبھی اسے اپنی خاطر میں لانا۔اس کا باپ بھی اسی قسم کا فراڈی آدمی تھا۔

............☆☆☆............

Short Stories

Kali Ke Bae Kali

By Sheikh Bashir Ahmad
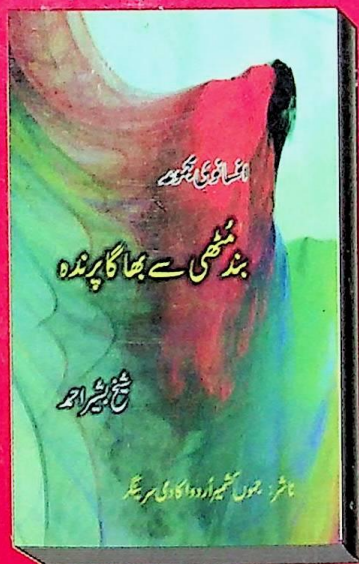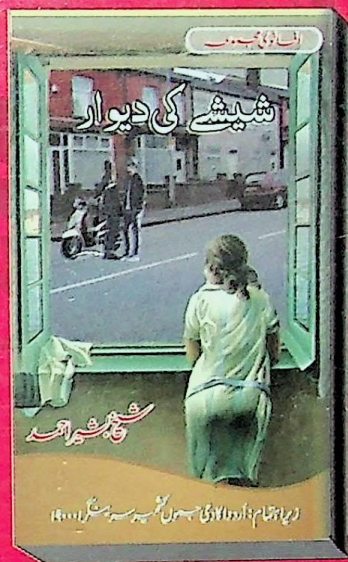
By: Urdu Akadmi Jammmu Kashmir Srinagar-190001